قیمت: پانچ روپے

انٹرنیشنل

ملی ٹائمز

نئی دہلی

اردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

مسلم اسپین زندہ ہو گیا

اس شمارے میں

- ☆ الیکشن مسئلہ کشمیر کا حل ہوتے تو یہ زخم ناسور نہیں بنتا
- ☆ جدید مورخین نے ثابت کیا ہے کہ قدیم ہندو گائے خور تھے
- ☆ ترکی کی فضاؤں میں اسرائیلی طیاروں کی جاسوسی
- ☆ مسلمان ذبح ہوتے رہے اور مغربی صحافی جھوٹ بولتے رہے
- ☆ گوڈسے خاندان کی دیوانگی سے بی جے پی کا رشتہ
- ☆ فٹبال ٹورنامنٹ اور فرینچ اوپن ٹینس پر مفصل رپورٹیں

اس کے علاوہ دیگر اہم موضوعات اور مستقل کالم

Country	Price
AUSTRALIA	A$ 3.50
BANGLADESH	Taka 20
BELGIUM	Fr 70
BRUNEI	B$ 4.50
CANADA	C$.3.50
CHINA	RMB 12.50
DENMARK	D. KR. 14.00
FRANCE	Fr 10
FINLAND	F. MK 10.00
GERMANY	DM3.50
HONG KONG	HK$ 15.00
INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)
ITALY	LIT. 3,000
JAPAN	
KOREA	W 1.800
MALAYSIA	RM 3.00
MALDIVES	Rf 12.00
NETHERLANDS	G 3.30
NEW ZEALAND	NZ$ 4.95
NORWAY	N. KR 12.00
PAKISTAN	Rs. 15
PHILIPPINES	P 25
SAUDI ARABIA	SR 3
SINGAPORE	S$ 2.50
SRI LANKA	Rs 40
SWEDEN	Kr 15
SWITZERLAND	Fr 3
THAILAND	B 40
U.K.	60p.
U.S.A.	$1.25

الیکشن ہی مسئلہ کشمیر کا حل ہوتا تو یہ زخم ناسور نہیں بنتا

مرکزی حکمراں جتنی جلد نوشتۂ دیوار پڑھ لیں ہندوستان کے لئے اتنا ہی بہتر ہوگا

سرینگر سے ابو الفت کی رپورٹ

ریاست جموں و کشمیر میں انتظار، اضطراب، کرب اور بے چینی کے سیاہ بادل جو کہ کشمیریوں کے ذہنوں پر منڈلا رہے تھے انوکھے اور مضحکہ خیز الیکشن کے اختتام کے ساتھ ہی فی الوقت چھٹ گئے۔ کشمیر میں ہونے والے الیکشن کی خصوصیات یہ ہیں۔

* اس الیکشن میں چناؤ لڑنے والے امیدواروں سے کشمیری عوام نا آشنا ہی نہیں بلکہ ان کے چناؤ نشان سے بھی بے خبر تھے۔

* راہ چلتے لوگوں کو، دفتر جاتے ملازمین کو اور اسکول و کالج جاتے طلبا کو بندوق کی نوک پر فوجی و نیم فوجی دستوں کے کیمپوں میں پہنچا کر انہیں انجان اشخاص کی تقاریر سننے پر مجبور کیا جاتا اور پھر ریڈیو اور دوردرشن سے نشر ہونے والی خبروں میں دعوی کیا جاتا کہ فلاں علاقے میں فلاں امیدوار نے عوام کے ایک جم غفیر سے خطاب کیا۔ دوسرے دن اس علاقے کے لوگ ایک دوسرے سے استفسار کرتے کہ ایسا جلسہ کہاں اور کب ہوا تھا؟

* عوام کو ووٹ کے "جمہوری حق" کو استعمال نہ کرنے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی جاتیں۔

* چناؤ سے کئی روز قبل ہی منظم طریقے سے عوام کے دلوں پر بٹھائے گئے خوف و دہشت کی وجہ سے الیکشن کے دن عوام کی اکثریت بشمول معصوم بچوں کے، خلاف معمول پو پھٹنے سے قبل ہی اپنے اپنے بستوں کو چھوڑ کر آنے والے خطرات سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔

* جہاں چناؤ کے روز دنیا کے ہر ایک ملک کے شہریوں میں بے حد جوش و خروش دیکھنے کو ملتا ہے وہیں کشمیر میں ہر ایک کشمیری کا چہرہ غم و یاس اور خوف و دہشت کا منظر تھا۔

* مسجد کے میناروں سے اس روز فجر کی اذان نہیں گونجی۔ اور اگر کہیں کسی مسجد سے اذان کی آواز آئی بھی تو اس مسجد کے تمام نمازیوں کو مسجد سے سیدھے پولنگ بوتھ پر مقررہ وقت سے دو گھنٹے قبل لے جایا گیا اور تب تک انہیں گھر جانے کی اجازت نہیں دی گئی جب تک کہ دوردرشن کی کیمرہ ٹیم نے ان کی عکس بندی نہ کرلی۔ مساجد کے لاوڈاسپیکروں سے اعلانات کے باوجود لوگ اپنے گھروں سے ووٹ ڈالنے کے لیے جب نہیں نکلے تو انہیں گھروں سے گھسیٹ کر مویشیوں کی طرح ہانک کر پولنگ بوتھوں تک لے جایا گیا جہاں ان سے "جمہوری حق" کا استعمال کرایا گیا۔ اگرچہ عوام کی اکثریت نے پھر بھی تمام امیدواروں کے نشانات پر مہر ثبت کرکے اپنی ناراضگی اور غم و غصے کا اظہار کیا۔

* ہندواڑہ کے ایک علاقے میں جبری پولنگ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مرد آبادی مقامی مسجد میں جمع ہوگئی جبکہ عورتیں ایک میدان میں اکٹھا ہوئیں۔ فوج نے عورتوں کے اس مجمع پر ہلہ بول کر کئی خواتین کو شدید زخمی کردیا۔ ایک آٹھ سالہ معصوم بچی کے سر پر بندوق کے بٹوں سے کئی وار کیے گئے وہ معصوم بچی ۲۴ مئی کو سری نگر کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے آپریشن تھیٹر میں جمہوریت کی بھینٹ چڑھ گئی۔

* پانچ ہزار ووٹروں کی ایک بستی میں فقط ۱۰۷ جبری ووٹ پڑے لیکن ریاستی الیکٹورل آفیسر نے دعوی کیا کہ اس علاقے میں تیس فیصد ووٹ کاسٹ کیے گئے۔ ادھر آزادی رائے کے چمپین قومی اخبارات سرکاری ترجمان کی ہاں میں ہاں ملا کر جمہوریت کی بیچ چوراہے پر ہورہی بے حرمتی پر خاموش رہ کر اپنے مقدس پیشے کے تقدس کو پامال کرتے رہے۔

الیکشن کے دن مسلح دستوں کی جبری کاروائیاں

اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتی ہیں کہ چناؤ کے اس شرمناک عمل نے ہند نواز عناصر کو بھی بھارت سے متنفر کردیا ہے کیونکہ الیکشن کے عمل کے دوران جمہوریت کے نام پر جو برتاؤ یہاں کے عوام سے روا رکھا گیا اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ان دل دہلانے والے واقعات کی باز گشت عالمی ذرائع ابلاغ میں سنائی دی ہے خود کشمیری عوام میڈیا اور فوج کے مضحکہ خیز رول کا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں مثلا ایک علاقے میں فوج کا ایک میجر اپنے جوانوں کے ہمراہ ایک محلے میں داخل ہوگیا۔ محلے کے مردوں سے کہا گیا کہ وہ سڑک پر ایک جگہ جمع ہوجائیں۔ میجر صاحب نے بھاشن دینا شروع کیا اور اپنے بھاشن میں مقامی ملازمین پر حکومت کا وفادار نہ ہونے کا الزام لگایا۔ پھر لوگوں سے کہا گیا کہ وہ پولنگ بوتھ پر ووٹ ڈالنے کے لیے جائیں۔ لیکن ایک شخص نے کھڑے ہوکر میجر سے کہا کہ ہم اپنا ووٹ ان لوگوں کو نہیں دیں گے جو تمہیں بھی مارتے رہے اور ہمیں بھی۔ اور اب ہم ہی سے ووٹ مانگ رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ نے اپنے کسی جوان کو الیکشن میں کھڑا کیا ہوتا تو ہم اسے ووٹ دینے کے لیے جوق در جوق نکلتے۔ بعد میں بی۔ ایس۔ ایف نے اس علاقے کے لوگوں کو سخت مار پیٹ کے بعد ووٹ ڈالنے پر مجبور کردیا۔

> آخر ملک کے حکمراں کیسے یہ توقع کرتے ہیں کہ طاقت کے بل پر کشمیریوں کو ہمیشہ کے لیے زیر کیا جاسکتا ہے۔ کشمیر میں بغاوت کی موجودہ صورت حال پچھلے چالیس برس کے اسی غیر جمہوری دھونس، دباؤ اور دھاندلی کا ردعمل ہے۔

آخر ملک کے حکمراں کیسے یہ توقع کرتے ہیں کہ طاقت کے بل پر کشمیریوں کو ہمیشہ کے لیے زیر کیا جاسکتا ہے۔ کشمیر میں بغاوت کی موجودہ صورت حال پچھلے چالیس برس کے اسی غیر جمہوری دھونس، دباؤ اور دھاندلی کا ردعمل ہے۔

اگر الیکشن کرانا ہی مسئلہ کشمیر کا حل ہوتا تو پچھلی نصف صدی کے دوران کشمیر میں نصف درجن الیکشن ہوئے ہیں اور جن میں عوام نے اپنی مرضی سے بھرپور شرکت بھی کی۔ لیکن پھر بھی یہ ناسور اپنی جگہ موجود ہے بھارت کے پالیسی ساز ادارے جو مختلف تجربے کشمیر میں کر رہے ہیں ان سے نہ صرف بھارت کی ساکھ بیرونی دنیا میں بری طرح متاثر ہوئی ہے بلکہ کشمیریوں کی نئی نسل کی نفسیات پر ایسے اثرات مرتب ہورہے ہیں جو مستقبل میں خوفناک نتائج کے حامل ہوسکتے ہیں۔

اب بھی وقت ہے کہ پالیسی ساز ادارے ٹھوس اقدام کریں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بندوق کے بل پر ہم زیادہ دیر تک اس بغاوت کو نہیں دبا سکتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کو دیر یا سویر حل کرنا ہی ہوگا۔ اور ہمارے حکمراں جتنی جلد اس نوشتہ دیوار کو پڑھیں گے بھارت کے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔

جدید مصنفین نے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم ہندو بھی گائے خور تھے

سچ تو یہ ہے کہ پورا ایشیا بلکہ پوری دنیا گائے کھاتی ہے

تحریر: ابو ابراہیم

کیا گئو کشی پر پابندی لگانا سیکولر اقدام ہے۔ ہندوتو فسلفے کے سچے سیکولر ہونے کا بھاجپائی دعوی اس وقت باطل ہونے لگتا ہے جب وہ لوگوں کو گوشت خوری سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گائے کی پرشتس بھی قدامت پسند ہندوؤں کی بہت نامعقول اور بے معنی عقائد کا ایک حصہ ہے۔ اور پھر کوئی حکومت اقلیتوں، ہریجنوں اور قبائلیوں پر گائے خوری پر پابندی کیسے لگا سکتی ہے جب کہ وہ ان کے لیے غذائی پروٹین کا اہم ترین ذریعہ اور ان کے طرز زندگی کا جزو لازم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پورا ایشیا بلکہ پوری دنیا گائے خور ہے اس کی وجہ جیسا کہ عام خیال ہے یہ نہیں کہ گائے کا گوشت سستا ہوتا ہے (کہیں یہ دیگر تمام اقسام سے مہنگا بکتا ہے) بلکہ اس لیے کہ گائے خوری دنیا کے بیشتر معاشروں کی روایت رہی ہے۔

اس معاملہ پر بیباک ترین انداز میں کسی نے روشنی اگر ڈالی ہے تو وہ ہیں ممبر پارلیمنٹ جی جی سویل۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ "اگر کوئی سامراجی طاقت شمال مشرقی علاقوں پر اپنے غذائی تصورات مسلط کرنے کی کوشش کرے گی تو اس علاقے میں اس کی زبردست مخالفت کی جائے گی اور اس کا وہی حشر ہوگا جو مغل فاتحوں کا ہوا تھا جنھوں نے میدان جنگ میں شکست کھائی۔" "میں لوک سبھا کا ممبر ہوتا تو میں مداخلت کرتے ہوئے ضرور یہ کہتا کہ شمالی ہند کے ہندوتو کے نظریہ پرستوں کا بھی یہی حشر ہوگا اگر وہ کیرالا کے باشندوں کی غذائی عادات میں دخل اندازی کریں گے۔ کیرالا کی نوے فیصد آبادی گائے خور ہے یا دوسروں کی گائے خوری پر معترض نہیں ہوتی۔ یہاں کے گائے خوروں میں بڑی تعداد اعلیٰ ذات کے افراد کی ہے اور یہاں تک کہ برہمن بھی شامل ہیں۔

مجھے تحفظ سے بچاؤ۔

گئو کشی پر پابندی کی معاشی نامعقولیت بھی جی جی سویل نے واضح کی اور بتایا کہ ہندوستان میں اسی فیصد مویشی عمر دراز یا ناکارہ ہوجاتے ہیں جن کا کوئی مصرف نہیں ہوتا علاوہ اس کے وہ زرخیز علاقوں کو بھی بنجر و بیابان بنادیں۔ لیکن جب تک گائے کا تحفظ ہندو بنیاد پرستی کا اصل الاصول بنا رہے گا۔ گائے پٹی کے جنونیوں کو کوئی معقول دلیل قائل نہیں کرسکتی۔ سویل نے بی جے پی پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ اس نے ملک کو واضح طور پر گائے پٹی اور غیر گائے پٹی میں بانٹ دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے لہجے میں کچھ درشتگی رہی ہو لیکن انہوں نے جو کچھ کہا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ ہمارے سیکولر آئین کو وضع کرنے والوں نے گائے کے تحفظ کو ڈائرکٹو پرنسپلز کا حصہ بنایا ہو۔ ممکن ہے کہ ایسا گاندھی جی کی دلی خواہش کے احترام میں کیا گیا ہے۔

بہر حال ملک کا دستور گائے کے گوشت کی پیداوار اور اس کے استعمال سے نہیں روکتا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ:

> ریاست جدید اور سائنسی خطوط پر زراعت اور مویشی پالنے کی صنعت کو فروغ دے گی اور خصوصا جانوروں کی نسلوں کو محفوظ رکھنے اور انہیں بہتر بنانے کی طرف توجہ دے گی۔ گایوں، بچھڑوں اور دودھ دینے والے جانوروں کو کاٹے جانے سے بچائے ی گی۔ اس میں ان بیلوں اور دیگر مویشیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو بے مصرف ہوجاتے س ہیں۔

جدید مورخین نے یہ واضح کیا ہے کہ قدیم ہندو گائے خور تھے لیکن ایسا کوئی ثبوت بھاجپائی مورخوں پر اثر انداز نہیں ہوپایا کیونکہ وہ تاریخ کو سمجھنے کے بجائے اس کی از سر نو تصنیف پر تلے ہوئے ہیں۔

اس ملک میں ایک نئی سیاسی صف بندی کا وقت آپہنچا ہے

ملی پارلیامنٹ کے اعلیٰ سطحی اجلاس سے وابستہ توقعات کا ایک جائزہ

کئی برسوں کی طویل علالت کے بعد بالآخر دشمن اسلام بالا صاحب دیورس آنجہانی ہوگئے۔ دیورس کی طویل متحرک اور سرگرم زندگی دراصل اسلام اور مسلم دشمنی سے عبارت تھی۔ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو انہوں نے اس ناپاک مشن کے لیے وقف کیے رکھا کہ سرزمین ہند سے اللہ اور اس کے رسول کے نام لیواؤں کا وجود کچھ اس طرح بے معنی بنادیا جائے کہ ایک عظیم عددی قوت کے باوجود وہ ایک بے بس غلامانہ سیاسی زندگی جینے پر آمادہ ہوجائیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دیورس اور ان کے ساتھیوں کو کسی نہ کسی حد تک اپنے مشن میں کامیابی ضرور ملی یہاں تک کہ ایک ایسی صورتحال پیدا ہوگئی جب ان کی مسلم دشمن فاشسٹ فکر کو ایک اچھوت نظریے سے آگے بڑھ کر عام ہندو ذہنوں میں بھی قابل قبول اور قابل عمل فلسفے کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔

دیورس کی موت پر جہاں بہت سے ہندو رہنماؤں نے اظہار تعزیت کیا ہے وہیں ٹیلی ویژن کی بعض رپورٹوں میں موجودہ وزیر اعظم دیوگوڑا کا نام بھی شامل ہے جنہوں نے اس رپورٹ کے مطابق دیورس کو سچا دیش بھکت بتایا ہے۔ انہی دیوگوڑا کے بارے میں باجپئی نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی کہ انہوں نے ایک موقع پر آر ایس ایس کو بے داغ تنظیم قرار دیا تھا۔ دیوگوڑا وہی وزیراعظم ہیں جو نام نہاد سیکولر قوتوں کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں اور جن کے وزیراعظم منتخب ہوجانے پر سادہ لوح مسلمانوں میں اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اور ان کی وزارت اور حمایت میں مسلمانوں کے وہ تمام مکار مسیحا موجود ہیں جنہیں سادہ لوح امت اپنا مسیحا سمجھتی ہے۔ ان کی حکومت میں ملائم سنگھ جیسے مسلم مسیحائی کا دعوی کرنے والے رہنما بھی موجود ہیں جنہیں کبھی سادہ لوح مسلمان مولانا ملائم سنگھ بھی کہا کرتے تھے۔ اس حکومت کو لالو یادو کی حمایت بھی حاصل ہے جنہیں مسلمانوں کو سبز باغ دکھا کر ان کے ووٹوں کی قیمت پر سیاست کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ اور ان کی حکومت میں رام ولاس پاسوان بھی شامل ہیں جنہیں مسلمانوں کی حمایت میں تقریر کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کی حکومت کو وی پی سنگھ جیسے بظاہر بے داغ "مسلم دوست" شخص کا آشیرواد بھی حاصل ہے۔ جنہیں نہ جانے کیوں مسلمانوں کے درمیان صاف ستھری شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نام نہاد مسلم حمایتی حکومت کا جائزہ لینے پر یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے کہ دیوگوڑا، باجپئی اور نرسمہاراؤ یہ سب ایک ہی شخصیت کے مختلف نام ہیں۔

> ملک کے دردمند مسلمانوں پر اس وقت یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے ایک ٹھوس لائحہ عمل ترتیب دیں تاکہ مسلمانوں کی مجبوری کے پیش نظر سیاسی فیصلہ کرنے کے بجائے یا اپنے دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن کو سیاسی قوت سونپنے کے بجائے اپنی بنیادوں پر خود کو متحد کرنے کا کام کرسکیں۔

متحدہ محاذ کی حکومت نے دلتوں کے لیے توریزرویشن کا وعدہ کیا لیکن مسلمانوں کے حصے میں صرف بابری مسجد کی طفل تسلی آئی جسے بیشتر مسلم تنظیموں نے قابل اعتنا نہیں گردانا۔ اس حکومت کو پچیس کروڑ مسلمانوں کے احساسات کی کوئی فکر نہیں۔ البتہ ڈیڑھ کروڑ سکھوں کو خوش کرنے کے لیے وزیر اعظم کشاں کشاں گولڈن ٹمپل چلے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سکھ اپنی بنیادوں پر سیاسی طور پر منظم ہیں۔ ان کے درمیان سکھ قوم کا مفاد بیچنے والے سیاستدانوں کی بڑی کمی ہے لیکن اس کے برعکس مسلمان سیاسی طور پر منتشر اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے خانوں میں ہیں جب تک ان کی کوئی اپنی آواز نہیں بنتی اور سیاسی طور پر مسلمان منظم نہیں ہوتے اس وقت تک کسی بہتر مستقبل کی بات سوچنا عبث ہے۔

> علی گڑھ کے اس مشاورتی اجلاس سے آگے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ ملی پارلیامنٹ ریاست کی تمام مسلم تنظیموں اور سیاسی شعور رکھنے والوں پر مشتمل ایک سیاسی کنونشن لکھنو میں جلد از جلد منعقد کرے تاکہ سیکولر بازی گروں کے ہاتھوں امت کو سیاسی استحصال سے بچایا جائے اور اس طرح مسلمانوں کی سیاسی قیادت پر کفار و مشرکین کے متمکن ہوجانے کا دور ختم ہو۔

یوپی میں اسمبلی انتخابات کے پیش نظر نئی سیاسی صف بندی کے لیے جوڑ توڑ کرنا شروع ہوچکا ہے۔ بی جے پی کے علاوہ ساری پارٹیاں مسلم ووٹوں کے تھوک حصول پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ یہ سوال سامنے لایا گیا ہے کہ بی جے پی کو اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے مسلمانوں کے لیے صرف ایک راستہ ہے یعنی ایس پی بی ایس پی کے کسی اتحاد یا اس قسم کی کسی سیاسی صف بندی کے حق میں اپنا ووٹ ڈالیں۔ ہر سیاسی بازیگر مسلمانوں کی جھوٹی ہمدردی کا سہارا لے کر ان کی ووٹوں کے حصول کے لیے بے تاب ہے۔ مسلمانوں کو ہندو احیا پرستوں سے ٹکرا کر مسلمانوں کی "قربانیوں اور ان کی جاں فشانیوں" کے بل بوتے پر اپنی حکومت کے قیام کا خواب ہر وہ سیاسی بازیگر دیکھ رہا ہے جسے ایک مسلم دوست چہرہ بنائے رکھنے پر قدرت حاصل ہے۔

ملک کے دردمند مسلمانوں پر اس وقت یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے ایک ٹھوس لائحہ عمل ترتیب دیں تاکہ مسلمانوں کی مجبوری کی پیش نظر سیاسی فیصلہ کرنے کے بجائے یا اپنے دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن کو سیاسی قوت سونپنے کے بجائے اپنی بنیادوں پر خود کو متحد کرنے کا کام کرسکیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان میں ایک نئی سیاسی صبح کا آغاز ہوسکتا ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلم تنظیمیں جلد از جلد کسی سیاسی فارمولے کے لیے فکر مند ہوں۔ اس ضمن میں جولائی کے آخری عشرے میں ملی پارلیامنٹ نے علی گڑھ میں جو اعلی مشاورتی اجلاس طلب کیا ہے توقع ہے کہ اس میں یوپی کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ بھی لیا جائے گا اور ان امکانات پر بھی غور کیا جائے گا کہ ریاست میں ایک نئی مسلم سیاسی قوت کا احیا کس طرح ممکن ہے۔ لیکن علی گڑھ کے اس مشاورتی اجلاس سے آگے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ ملی پارلیامنٹ ریاست کی تمام مسلم تنظیموں اور سیاسی شعور رکھنے والوں پر مشتمل ایک سیاسی کنونشن لکھنو میں جلد از جلد منعقد کرے تاکہ سیکولر بازی گروں کے ہاتھوں امت کو سیاسی استحصال سے بچایا جائے اور اس طرح مسلمانوں کی سیاسی قیادت پر کفار و مشرکین کے متمکن ہوجانے کا دور ختم ہو۔

The Milli Fellowships *for Journalism*

The Milli Times International invites applications on plain paper for the following positions, to commence from September, 1996.

Junior Fellowship (2 positions)
Salary US $ 1200 p.a. or Equivalent + other facilities

Senior Fellowship (1 position)
Salary US $ 2100 p.a. or Equivalent + other facilities

Applicants should have a natural talent for writing in Urdu and English. A degree in journalism or management will be preferred. Preference will be given to young people (male or female) with prior experience in this field. Selected candidates will be expected to use the newest computer based technology. For the senior position applicant should have substantial experience, preferably in a newspaper or news magazine plus an appropriate academic qualification.

To be assured of full consideration, applications should be sent by August 10, 1996 to:

Scholarship Committee
Milli Times International
D-49 Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-25
Tel: +91-11-6827018 Fax: +91-11-6926030

مزید تاخیر آپ سے یہ موقع بھی چھین لے گی

۲۱ تا ۲۸ جولائی

علی گڑھ میں منعقد ہونے والے تربیتی ورکشاپ میں شرکت دراصل ایک ایسا موقع ہوگا جس میں آپ اپنی زندگی کے کامیاب ترین استعمال کا سلیقہ سیکھیں گے۔

ہفتہ بھر شب و روز آپ ان لوگوں کے درمیان ہونگے جو ہر قیمت پر اس ملک میں ایک نئی صبح کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔

اور اسی موقع پر ملی پارلیامنٹ اپنا اعلی سطحی مشاورتی اجلاس بھی منعقد کرے گی جس میں آنے والے دنوں کے لیے کام کا خاکہ تیار کیا جائے گا۔

ورکشاپ کی اس غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر قائد ملی پارلیامنٹ نے دردمندان امت سے خاص طور پر اپیل کی ہے کہ جو لوگ ملی پارلیامنٹ کے مختلف اجلاس میں شریک ہوچکے ہیں وہ اس تربیتی کیمپ میں ضرور شریک ہوں۔

البتہ نشستوں کی کمی کی وجہ سے لازم ہے کہ آپ شرکت کی اطلاع اپنی آمد سے قبل دیں۔

ضروری تفصیلات:

۱۔ پروگرام کا آغاز ۲۱ جولائی کی شام کو ہوگا اس لیے شرکاء لازماً دوپہر تک علی گڑھ پہونچ جائیں۔

۲۔ ۲۸ جولائی دوپہر تک پروگرام اختتام کو پہونچے گا۔ شرکاء اپنی واپسی کا ریزرویشن ابھی سے کرالیں تاکہ عین وقت پر دشواری پیش نہ آئے۔

۳۔ رجسٹریشن فیس ۲۰۰ سے ۵۰۰ روپے (حسب استطاعت) رکھی گئی ہے جس میں قیام و طعام کے انتظامات بھی شامل ہیں۔ البتہ طلبا و طالبات کے لیے کوئی فیس نہیں ہوگی۔

۴۔ اگر آپ کو شرکت کی منظوری یا دعوت نامہ مل چکا ہے اور کسی وجہ سے آپ کی شرکت مشکوک نظر آتی ہو تو فوراً بذریعہ تار مطلع کریں تاکہ آپ کی نشست کسی اور کو دی جاسکے۔

Institute Of Muslim Ummah Affars,
Milli Parliament Building,
4/1176-D, New Sir Syed Nagar, Aligarh-202002. Tel&Fax (o571) 400182

اب ترکی کی فضاؤں میں اسرائیلی طیارے چہل قدمی اور فضائی جاسوسی کریں گے

امریکہ نے ایران عراق کو پابہ زنجیر کرنے کے لئے ترکی اور اسرائیل میں معاہدہ کروا دیا

سب سے پہلے یہ خبر تقریباً دو ماہ قبل ایران سے آئی کہ ترکی اور اسرائیل کے درمیان ایک خفیہ فوجی معاہدہ ہوا ہے۔ بعد میں خفیہ معاہدہ علی الاعلان سامنے آگیا۔ مسلم دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ آیئے دیکھیں کہ ترکی۔ اسرائیل فوجی معاہدے کے پیچھے کارفرما عوامل اور اس کے مضمرات کیا ہیں؟

دراصل یہ معاہدہ امریکہ کی ایران، عراق اور کسی حد تک شام کو آگے بڑھنے سے روکنے کی پالیسی کا آئینہ دار ہے۔ یہ معاہدہ بڑے خفیہ انداز میں ۱۸ فروری کو عمل میں آیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد اسرائیلی جہازوں نے ترکی میں مشقیں کیں۔ اس معاہدے کے ذریعے دونوں ملکوں کی فضائیہ کے درمیان تعاون پر زور دیا گیا ہے۔ پہلی بار اسرائیلی جہاز ترکی کی فضائی سہولتوں کو استعمال کریں گے۔ دونوں ملکوں کی فضائی فوجیں مشترکہ مشقیں بھی کریں گی۔ اسی کے ساتھ اسرائیل ترکی میں فضائی جاسوسی کا نظام بھی قائم کرے گا جس سے وہ شام اور ایران کے بارے میں اہم معلومات جمع کرے گا۔ یہ فضائی جاسوسی نظام ترکی کی اس کی کردوں کے خلاف جنگ میں بھی مدد دے گا۔ اس معاہدے کے مطابق دونوں ملکوں کے جاسوسی اداروں میں تعاون کے لیے ایک سیکورٹی فورم بھی قائم ہو گا۔

اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ اس معاہدے کا مقصد محض اسرائیلی جہازوں کو مشق کے لیے وسیع فضائیں فراہم کرنا نہیں ہے جیسا کہ اسرائیل اور امریکہ کہتے ہیں۔ دراصل یہ ترکی۔ اسرائیلی فوجی تعاون کی ایک کڑی ہے۔ اس تعاون کا آغاز بہت پہلے ہوا۔ ترکی نے امریکی کمپنیوں کو نظرانداز کر کے اسرائیل سے ۶سو ملین ڈالر کا ایک معاہدہ کیا ہے جس کے مطابق آخر الذکر ترکی کے امریکی ہتھیاروں کی جدید کاری کا کام انجام دے گا۔ ترکی اسرائیل سے ۵۰ ملین ڈالر کے ہتھیار بھی خریدے گا جن میں پوپٹ جیسے جدید میزائل بھی شامل ہیں۔

اتنی بات واضح ہے کہ اس معاہدے سے ترکی کی بہ نسبت اسرائیل کو زیادہ فائدہ پہونچے گا۔ ترکی پیسے دے کر جو کام اسرائیل سے لے رہا ہے وہ امریکی کمپنیاں بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن اسرائیل ترکی کی فضاؤں کو دو مسلم ممالک کے خلاف جاسوسی کے لیے استعمال کرے گا۔ ترکی کی فضاؤں میں وہ محض اپنے پائلٹوں کی تربیت نہ کرے گا بلکہ ضرورت پڑنے پر وہاں سے ایران و شام کے خلاف حملے بھی کر سکتا ہے۔

> پہلی بار اسرائیلی جہاز ترکی کی فضائی سہولتوں کو استعمال کریں گے۔ دونوں ملکوں کی فضائی فوجیں مشترکہ مشقیں بھی کریں گی۔ اسی کے ساتھ اسرائیل ترکی میں فضائی جاسوسی کا نظام بھی قائم کرے گا جس سے وہ شام اور ایران کے بارے میں اہم معلومات جمع کرے گا۔ یہ فضائی جاسوسی نظام ترکی کی اس کی کردوں کے خلاف جنگ میں بھی مدد دے گا۔

اس معاہدے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ترکی کی مغربی ایشیاء کی پالیسی میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ اب تک ترکی پالیسی چار نکات پر مشتمل تھی۔ اول عرب کاز کی حمایت، دوم عرب تنازعات میں غیر جانب داری برتنا، سوم اسرائیل سے کم سے کم تعلقات اور چہارم عرب ممالک سے صنعت و تجارت اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں زیادہ سے زیادہ تعاون کرنا۔ چنانچہ ان پالیسیوں کے تحت ترکی نے اقوام متحدہ میں ہمیشہ عربوں کا ساتھ دیا۔ ۱۹۷۵ میں اس نے اس قرارداد کی حمایت کی جس کے ذریعہ صہیونیت کونسل پرستی قرار دے کر اس کی مذمت کی گئی ہے۔ ترکی نے اسی طرح عربوں کی خواہش کے مطابق پی ایل او کو فلسطینیوں کا واحد نمائندہ بھی تسلیم کیا، حالانکہ اس سے اس کے اردن سے تعلقات میں سرد مہری بھی آئی۔ واضح رہے کہ اردن عرب دنیا میں ترکی سے ہمیشہ سب سے قریب رہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۹ میں ترکی حکومت نے پی ایل او کو اپنے یہاں اپنا آفس کھولنے کی اجازت دی۔ اس کے چھ ماہ بعد جب اسرائیل نے مشرقی یروشلم کو اسرائیل کا حصہ قرار دیا تو ترکی نے اس کی مذمت کی اور تل ابیب سے اپنے سفارتی امور کے انچارج کو واپس بلالیا۔

☆ تانتر و سیلر چند رہنماؤں کے ساتھ

اسی طرح ترکی نیٹو تنظیم کا پہلا ملک تھا جس نے آزاد فلسطینی ریاست کو تسلیم کیا، جب ۱۹۸۳ میں پی۔ این۔ سی نے فلسطین کے ایک آزاد مملکت ہونے کا اعلان کیا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ترکی کا اسرائیل سے حالیہ فوجی معاہدہ اس کی مغربی ایشیا کی پالیسی میں زبردست تبدیلی کا حامل ہے۔

اس اس معاہدے کا اولین مقصد تو وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا، یعنی ایران اور عراق کو کنٹرول کرنے کی امریکی خواہش کی تکمیل کرنا۔ لیکن اس کے ذریعے ترکی بعض فوائد بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ترکی کے بعض مبصروں نے کہا ہے کہ یہ دراصل شام کے یونان کے ساتھ معاہدے کا جواب ہے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو شام۔ یونان سیکورٹی معاہدہ بہت محدود ہے اور اس سے یونان کو ترکی کے خلاف کوئی فائدہ نہیں پہونچتا جب کہ ترکی۔ اسرائیل معاہدے کا مقصد ہی بعض مسلم ممالک کے خلاف محاذ آرائی ہے۔ دراصل ترکی اس معاہدے کے ذریعہ امریکہ میں طاقتور یہودی لابی کا تعاون

باقی صفحہ ۶ پر

پاکستان کرپشن کے دلدل میں گلے گلے تک ڈوبا ہوا ہے

پاکستان کی سماجی۔ سرکاری۔ عدالتی و تجارتی خرابیوں کو تہ در تہ کھولنے والی ایک سچوئشن رپورٹ

امریکہ میں ایسے بہت سے ادارے کام کرتے ہیں جو مختلف ممالک کے بارے میں "سچویشن رپورٹس" یعنی موجودہ حالات کے بارے میں رپورٹیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مقاصد موقع و محل کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے مطالعات بڑے بڑے تاجر گھرانے بھی اپنے مقاصد کے پیش نظر کراتے ہیں۔ مدعا یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ فلاں ملک میں سرمایہ کاری ہر اعتبار سے مفید ہوگی یا نہیں۔ ایسے تاجر گھرانے مطالعہ کرنے یا رپورٹ تیار کرنے والوں سے تین چیزوں پر خاص طور سے توجہ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اول ملک کا سیاسی استحکام، معیشت کہاں تک فری یا کھلی ہوئی ہے اور اس میں بیورو کریسی کا رول کیا ہے اور تیسرے یہ کہ عدالت کس حد تک آزاد ہے۔ رپورٹ تیار کرنے والے بعض دوسرے ضمنی معاملات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں مثلاً ٹریڈ یونین اور انسانی حقوق وغیرہ۔

حال ہی میں ایک ایسے ہی امریکی ادارے "فریڈم ہاؤس" نے پاکستان کے بارے میں ایک سچویشن رپورٹ شائع کی ہے جو تھوڑی بہت جانبداری کے باوجود بڑی چشم کشا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق پورے پاکستان کی دولت اندازاً پانچ سو خاندانوں میں سمٹی ہوئی ہے۔ یہ خاندان بڑے بڑے زمینداروں اور صنعت کاروں کے ہیں جن کے کافی سیاسی اثرات ہیں۔ اس رپورٹ یا جائزے کے مطابق کرپشن پاکستانی سماج کے ہر شعبے میں پھیلا ہوا ہے اور کوئی بھی تجارتی معاملہ رشوت اور دوسری ایسی خرابیوں سے شاید ہی پاک ہوتا ہو۔ اس جائزے میں بے نظیر حکومت پر یہ کہہ کر تنقید کی گئی ہے کہ یہ صرف اپنے مخالفین کے تجارتی معاملات کی تفتیش کراتی ہے۔ جائزے میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ نجی سرمایہ کاری کی ہر معاشی شعبے میں اجازت ہے لیکن عملاً ایسا کرنا کافی دشوار ہے کیونکہ بیورو کریسی ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے تاکہ متوقع سرمایہ کاروں سے روپیہ اینٹھ سکے۔ تجارتی معاملات اور معاہدات میں رشوت اور اقربا پروری کا اصل رول ہوتا ہے۔ دراصل حکومت کے ٹھیکے وغیرہ بالعموم انہیں لوگوں کو ملتے ہیں جن کے ارباب اقتدار سے تعلقات اچھے یا جن کا اثر و رسوخ کافی ہے۔

جائزے میں پاکستان کے معاشی دارالحکومت کراچی کی صورتحال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کراچی میں امن و امان کی ابتری کی وجہ سے باہری سرمایہ کاری پر اثر پڑا ہے۔ کراچی کے مزدور یا نوکری پیشہ افراد میں سے اوسطاً تیس فیصد کسی بھی دن غیر حاضر ہوتے ہیں۔ کراچی میں زبردستی پیسہ وصول کرنے کی بیماری بھی عام ہے۔

☆ کراچی کی ایک سڑک پر فوجیوں کا گشت

فریڈم ہاؤس کے جائزے میں پاکستان کے عدالتی نظام کی خرابیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس جائزے کے مطابق کرپشن عدالتی نظام میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ دراصل عدالتی نظام کمزور، بے اثر اور رجسٹری کا نظام ناقص ہے جس کی وجہ سے زمین وغیرہ کی ملکیت کا تحفظ غیر یقینی ہے۔ چنانچہ نیا بزنس شروع کرنا ایک کارے دارد ہے اور قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے سرمایہ جمع کرنا سب سے مشکل ہوتا ہے۔

حقوق انسانی کی پامالی پاکستان میں عام ہے۔ اگرچہ بندھوا مزدوری کو ختم کرنے کا ایکٹ ۱۹۹۲ میں پاس ہو گیا تھا مگر اس کی تنفیذ پر خاص طور سے صوبوں میں، توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کم از کم ایک زمیندار کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ اس کی اپنی جیل ہے جہاں بندھوا مزدوروں کو رکھا جاتا اور ان سے کام لیا جاتا ہے۔ جائزہ کے مطابق ایسی دوسری جیلوں کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا

ٹریڈ یونین یوں تو ہر سطح پر پائی جاتی ہے لیکن یہ حکومت کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ خاص طور سے ان کی قانونی حیثیت بہت مستحکم نہیں ہے۔ چنانچہ مزدوروں کے حقوق محفوظ نہیں کہے جاسکتے۔

پاکستان میں نجی کاری اور معیشت کی آزادی کا سلسلہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہی شروع ہو گیا تھا جسے بے نظیر نے اپنے حالیہ دور اقتدار میں آگے بڑھانے کی بھی کوشش کی ہے۔ ۱۹۹۴ میں

باقی صفحہ ۶ پر

جماعت اسلامی اور متحدہ اسلامی محاذ کی جنگ میں حسینہ کامیاب

کیا اب بنگلہ دیش ہندوستان کے زیر اثر آجائے گا

گذشتہ دنوں ہونے والے بنگلہ دیش کے پارلیمانی انتخابات کے تین سو میں سے ۲۷۳ سیٹوں کے نتائج کا اعلان ہو چکا ہے۔ بقیہ ۲۷ سیٹوں کے لیے ان پولنگ اسٹیشنوں پر دوبارہ ووٹنگ ہوگی جہاں تشدد یا دوسری کسی خرابی کی وجہ سے الیکشن رد کردیا گیا تھا۔ اعلان شدہ نتیجے کے مطابق بنگلہ دیش کی آزادی کے لیڈر شیخ مجیب الرحمن کی صاحبزادی حسینہ واجد کی عوامی لیگ کو ۱۴۶ سیٹیں ملی ہیں اور یہ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری ہے۔ ایک آزاد امیدوار نے عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کرلی ہے جس سے اب اس کے منتخب ممبروں کی تعداد بڑھ کر ۱۴۷ ہو گئی ہے۔ خالدہ ضیاء کی بی این پی یا بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کو صرف ۱۰۴ سیٹیں ملی ہیں جبکہ جیل میں بند حسین محمد ارشاد کی جاتیہ پارٹی کو ۲۹ اور جماعت اسلامی کو توقعات کے برعکس صرف دو سیٹیں ملی ہیں۔ واضح رہے کہ تحلیل شدہ اسمبلی میں جماعت کے کل ۲۰ ممبران پارلیمنٹ تھے۔ جماعت کی اس خراب کارکردگی کے اسباب پر ہم ذرا بعد میں روشنی ڈالیں گے۔

> اس غریب ملک میں مسائل کی کمی نہیں ہے اور کسی بھی اپوزیشن پارٹی کے پاس ایسے مسائل ہوتے ہیں جنہیں لے کر وہ سڑکوں پر آسکتی ہے جہاں پولیس و مظاہرین کے درمیان تصادم ہوسکتا ہے یا کسی دوسری وجہ سے تشدد پھوٹ سکتا ہے۔

بنگلہ دیش اپنی آزادی کے بعد ہی سے مختلف سیاسی بحرانوں سے گذرا ہے۔ حالیہ انتخاب بھی ایک بحران ہی کا نتیجہ ہے۔ خالدہ ضیاء حکومت کے خلاف حسینہ واجد کے ساتھ دوسری تمام پارٹیوں نے اس امر کے لیے مہم چلائی تھی کہ انتخاب کوئی غیر جانبدار حکومت کرائے۔ اس مسئلے کو لے کر مہینوں بنگلہ دیش میں ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ خالدہ ضیاء نے پہلے تو اس مطالبے کو رد کردیا لیکن بعد میں اس پر راضی ہو گئیں۔ چنانچہ اب یہ انتخاب غیر جانبدار حکومت کی نگرانی ہی میں ہوئے ہیں۔ غیر ملکی مبصروں کے بقول انتخابات آزادانہ و منصفانہ رہے جبکہ بی این پی اور جاتیہ پارٹی کے ہارے ہوئے امیدواروں کے بقول عوامی لیگ نے بڑے پیمانے پر دھاندلی کی۔ اس کا یہی مطلب لیا جاسکتا ہے کہ شاید اب خالدہ ضیاء کچھ مہینوں کے بعد بنگلہ دیش میں وہی کچھ کریں گی جو اس انتخاب سے قبل تک حسینہ واجد کرتی رہیں یعنی ہڑتالوں کا ایک نیا سلسلہ۔ اس غریب ملک میں مسائل کی کمی نہیں ہے اور کسی بھی اپوزیشن پارٹی کے پاس ایسے مسائل ہوتے ہیں جنہیں لے کر وہ سڑکوں پر آسکتی ہے جہاں پولیس و مظاہرین کے درمیان تصادم ہوسکتا ہے یا کسی دوسری وجہ سے تشدد پھوٹ سکتا ہے۔

حالیہ انتخابات کے نتائج کا سب سے چونکا دینے والا پہلو جماعت اسلامی کی خراب کارکردگی ہے۔ تمام ہی مبصرین کی متفقہ رائے تھی کہ جماعت کی کارکردگی اس بار پہلے سے زیادہ بہتر ہوگی۔ اول تو یہ کہ پہلی بار جماعت نے تمام تین سو حلقوں سے اپنے امیدوار کھڑے کیے تھے۔ دوسرے یہ کہ خالدہ ضیاء حکومت کے خلاف وہ مستقلاً اپوزیشن کے ساتھ رہی تھی۔ تیسرے یہ کہ تسلیمہ نسرین اور رشدی وغیرہ کے معاملے کو لے کر جماعت نے عوام سے رابطے کی بھرپور مہمیں چلائی تھیں۔ بالعموم جماعت کی ریلیوں میں زبردست بھیڑ جمع ہوا کرتی تھی۔ جماعت سے اچھی کارکردگی کی امید کی چوتھی وجہ پروفیسر غلام اعظم کی شہریت کی بحالی کے بعد ان کا امیر جماعت منتخب ہونا تھا۔

ان سارے حوصلہ افزا عوامل کے باوجود جماعت کی کارکردگی انتہائی غیر موثر رہی۔ اصل اسباب کا پتہ تو انتخابی گرد کے بیٹھنے کے بعد ہی ہوسکے گا لیکن فی الفور جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ جماعت کی بعض پالیسیاں خصوصا خارجہ محاذ پر بی این پی سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً دونوں ہی جماعتیں ہندوستان سے دوستی کے معاہدے کی تجدید کے خلاف ہیں۔ اس طرح جو ہندوستان کی بالادستی کے مخالف تھے اور سوچتے تھے کہ حسینہ واجد کی کامیابی کی صورت میں ہندوستان کا بنگلہ دیش میں اثر بڑھ جائے گا، انہوں نے جماعت کو نظر انداز کرکے بی این پی کو ووٹ دیا کیونکہ وہ جماعت کی بہ نسبت بڑی پارٹی تھی اور اس کے برسر اقتدار آنے کی امید زیادہ تھی۔

☆ حسینہ واجد اپنے انتخابی نشان کشتی کے ساتھ

دوسری وجہ یہ رہی کہ پہلی بار بنگلہ دیش میں اسلام کے نام پر کئی پارٹیاں انتخابی میدان میں اتر پڑیں۔ تسلیمہ نسرین مخالف مہم میں صرف جماعت ہی نہیں ائمہ مساجد اور مختلف مسلکوں سے وابستہ علماء بھی تھے۔ یہ لوگ جماعت کی آئیڈیالوجی سے متفق نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر اپنی تنگ ذہنی کی وجہ سے نام نہاد سیکولر قوتوں کو برداشت کرلیتے ہیں لیکن جماعت کے ساتھ تعاون سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ان علماء وائمہ مساجد نے اپنا ایک متحدہ اسلامی محاذ بنالیا تھا جو اپنے پرچم کے تحت انتخاب لڑرہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پسندوں کا ووٹ بٹ گیا اور یہی دراصل جماعت اور محاذ دونوں کی ناقص کارکردگی کا موجب بنا۔

انتخابات بہرحال ہوچکے ہیں۔ ۲۷ سیٹوں کے نتائج بہت جلد آجائیں گے۔ اگر ان میں سے ۱۷ سیٹیں عوامی لیگ کو مل جاتی ہیں تو اپنے بل پر حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہوگی۔ بہرکیف اتنی بات طے ہے کہ حکومت عوامی لیگ ہی کی بنے گی کیونکہ جاتیہ پارٹی، جس کے ایوان میں ۲۹ ممبران ہیں، نے عوامی لیگ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا ہے۔ لیکن باخبر حلقوں کے مطابق یہ حمایت غیر مشروط نہیں بلکہ حسین محمد ارشاد کی جیل سے رہائی سے وابستہ ہے۔ حسین محمد ارشاد کے خلاف حسینہ واجد، خالدہ ضیاء اور جماعت تینوں نے مہم چلائی تھی۔ لیکن اس کے بعد جو انتخابات ہوئے اس میں کامیابی بی این پی کو ملی۔ بی این پی حکومت نے ارشاد کے خلاف کرپشن کا مقدمہ چلایا اور انہیں جیل ہوگئی۔ فی الحال ارشاد نے صدر بسواس کی تجویز رد کردی ہے کہ وہ پیرول پر پندرہ دنوں کے لیے رہا ہوجائیں۔ عوامی لیگ کی حکومت بننا تقریباً طے ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو شیخ مجیب الرحمان کے قتل کے بعد وہ اور ان کی پارٹی پہلی بار برسر اقتدار آئیں گی۔ شیخ حسینہ کے سامنے زبردست مسائل ہوں گے۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ وہ ان سے کس طرح نبرد آزما ہوتی ہیں۔

> پہلی بار بنگلہ دیش میں اسلام کے نام پر کئی پارٹیاں انتخابی میدان میں اتر پڑیں تسلیمہ نسرین مخالف مہم میں صرف جماعت ہی نہیں ائمہ مساجد اور مختلف مسلکوں سے وابستہ علماء بھی تھے۔ ان علماء وائمہ مساجد نے اپنا ایک متحدہ اسلامی محاذ بنالیا تھا جو اپنے پرچم کے تحت انتخاب لڑرہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پسندوں کا ووٹ بٹ گیا اور یہی دراصل جماعت اور محاذ دونوں کی ناقص کارکردگی کا موجب بنا۔

فوجی تو یے داغ چھوٹ جائیں گے مگر

عائشہ کی عصمت پر لگے داغ کا کیا ہوگا؟

۱۷ سالہ کشمیری لڑکی عائشہ ایک دوسری خاتون کے ساتھ کپواڑہ ضلع کے لنگیت قصبہ میں اپنے کھیت میں کام کررہی تھی۔ فوج کی ایک ٹکڑی نے جو کہ معمول کی گشت پر نکلی ہوئی تھی ان دونوں کو دیکھا اور ان کی حیوانیت بیدار ہو گئی۔ فوجی جوان جو کہ عزت و ناموس کے رکھوالے ہوتے ہیں دونوں خواتین کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈری سہمی خواتین بھاگنے لگیں مگر عائشہ ان کے چنگل میں پھنس گئی۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ ان کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی اور پھر فوجی جوانوں نے اس کی چادر عصمت تار تار کردی۔ یکے بعد دیگرے چار فوجیوں نے اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا اور اب وہ مظلوم اس رسوائی کا کلنک اپنی پیشانی پر لگائے جینے پر مجبور ہے۔

مذکورہ واقعہ علاقہ کے باشندوں کے بیانات پر مبنی ہے۔ اس واقعہ کی خبر پھیلتے ہی علاقے میں کشیدگی پھیل گئی اور لوگ احتجاج کرنے نکل پڑے۔ مسلسل دو دنوں کے احتجاج کے بعد پولیس ایف آئی آر درج کرنے پر تیار ہوئی۔ حالانکہ اسے ایف آئی آر درج کرنے میں بڑا پس و پیش تھا۔ لیکن احتجاج کے آگے اسے جھکنا پڑا۔ حریت کانفرنس نے اس واقعہ کے خلاف ایک دن کی ہڑتال رکھی۔ اب پولیس نے ایک فوجی کو حراست میں لیا ہے اور ضلع کے سول اور پولیس افسران اس واقعہ کی تحقیقات کررہے ہیں۔ پولیس خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ لنگیت پولیس تھانہ کے سامنے دو دن کے احتجاج کے بعد رات میں جاکر اس نے ایف آئی آر درج کی جس کا نمبر ۹۶ / ۱۳۲ ہے۔ محکمہ دفاع کے ترجمان کا کہنا ہے کہ جو بھی قصوروار پایا جائے گا اس کے خلاف سخت کارروائی ہوگی۔ دیکھا جائے تو یہ پہلا واقعہ نہیں ہے۔ جب سے وہاں فوج تعینات ہوئی ہے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شادی شدہ بھی اور بعض غیر شادی شدہ خواتین بھی فوجیوں کا گناہ اپنے پیٹوں میں پالنے پر مجبور ہیں۔ لیکن پولیس ایسے واقعات کی ایف آئی آر درج نہیں کرتی۔ شاید اسے ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے یا پولیس ایسے واقعات کی پشت پناہی کرتی ہے۔ مذکورہ واقعہ میں چار جوانوں نے عائشہ کے ساتھ منہ کالا کیا لیکن حراست میں صرف ایک جوان کو لیا گیا ہے اور وہ بھی پوچھ گچھ کے لیے۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ جوان چھوٹ جائے گا۔ کیونکہ عائشہ کا الزام ثابت نہیں ہوپائے گا وہ کسی کی گواہی نہیں پیش کرپائے گی۔ لہٰذا وہ فوجی جوان اور اس کے دوسرے ساتھی تو بے داغ چھوٹ جائیں گے لیکن جو داغ عائشہ کی زندگی پر لگ گیا ہے وہ کیسے چھوٹے گا؟ کیا اس کا بھی کوئی علاج پولیس، فوج یا حکومت کے پاس ہے؟

> فوجی جوان جو کہ عزت و ناموس کے رکھوالے ہوتے ہیں دونوں خواتین کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈری سہمی خواتین بھاگنے لگیں مگر عائشہ ان کے چنگل میں پھنس گئی۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ ان کی گرفت سے آزاد نہ ہوسکی اور پھر فوجی جوانوں نے اس کی چادر عصمت تار تار کردی۔ یکے بعد دیگرے چار فوجیوں نے اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا اور اب وہ مظلوم اس رسوائی کا کلنک اپنی پیشانی پر لگائے جینے پر مجبور ہے

سرحد پار کرتے ہی اس کی عصمت دری ہوئی اور پھر کوٹھے کی زینت بنادی گئی

ملازمت کی لالچ میں سادہ لوح خواتین آسانی سے مجرموں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں

مغربی یوروپ میں جبریہ جسم فروشی کی عبرتناک داستان

اسے ایسا لگا جیسے اسے اس کے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے۔ گریزیانا، ایک تیس سالہ مطلقہ پولینڈ کی رہنے والی ہے۔ اسے پچھلے دنوں جب ایک ایجنسی نے خبر دی کہ جرمنی کے ایک ریسٹورینٹ میں اسے ۸ سو پاؤنڈ ماہانہ پر نوکری مل سکتی ہے تو اس کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے سوچا کہ بالاخر وہ اتنا کما سکے گی کہ اپنے دونوں بچوں کی اچھی طرح پرورش کرسکے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد اسے پتہ چلا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

جیسے ہی گریزیانا سرحد پار کرکے جرمنی میں داخل ہوئی، اس کے ساتھ کچھ لوگوں نے زنا بالجبر کیا اور پھر اس سے کہا کہ اسے ایک طوائف کی حیثیت سے کام کرنا ہوگا۔ یہ ایک ڈراؤنے خواب کی ابتدا تھی۔ گریزیانا کو دراصل ۱۲ سو پاؤنڈ کے عوض فروخت کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے جرمنی کے بجائے ہالینڈ لے جایا گیا جہاں اسے ملک کے ایک بدنام زمانہ طوائف خانے میں جسم فروشی پر مجبور کیا گیا۔ وہ وہاں سے فرار ہوئی لیکن مجرموں نے اسے تلاش کرلیا اور پھر اسی طوائف خانے میں گھناونے عمل پر مجبور کیا۔ گریزیانا نے بعد میں اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہا: میں دہشت زدہ تھی۔ اگر میں زیادہ نہ کماتی تو مجھے مارا جاتا۔ وہ سر پر ضربیں لگاتے یا پیٹ پر لات مارتے۔ انہوں نے مجھے بندوقیں دکھائیں اور کہا کہ اگر میں نے تعاون نہیں کیا تو وہ مجھے مار کر میرے مردہ جسم کو کسی نہر میں بہا دیں گے جہاں مجھے کوئی پہچان بھی نہیں پائے گا۔

آج گریزیانا بظاہر آزاد ہے اور ہالینڈ میں پناہ کی طالب ہے۔ گریزیانا کا معاملہ کوئی استثنائی معاملہ نہیں ہے۔ یوروپی پولیس کا کہنا ہے کہ ایسی ہزاروں عورتیں مشرقی یوروپ سے بہلا پھسلا کر لائی جاتی ہیں اور پھر انہیں جسم فروشی پر مجبور کردیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے نئے انداز کی غلاموں کی تجارت ہے، سفید فام غلاموں کی تجارت۔

ماہرین کا خیال ہے کہ یہ محض پولس کا معاملہ نہیں ہے جسے آپ سرحد بند کرکے حل کرسکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یوروپ کے اکثر ممالک میں طوائف خانے کے لیے لڑکیاں زبردستی حاصل کرنا کوئی بہت بڑا جرم نہیں ہے۔ مثلاً سویڈن میں اگر کوئی ڈرگ لے جاتے ہوئے پکڑا جاتا ہے تو اسے ۱۰ سے ۱۲ سال قید کی سزا ہوتی ہے لیکن جو لوگ جسم فروشی کے لیے عورتوں کی اسمگلنگ کرتے ہیں انہیں ایک یا دو سال کی سزا ملتی ہے۔

مغربی یوروپ میں جسم فروشی کے لیے مشرقی یوروپ سے عورتیں اسمگل کرنے والے افراد بہت منظم ہیں۔ مشرقی یوروپ کے دلال، مغربی یوروپ کے بدمعاشوں کے تعاون سے کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ بالعموم وارسا، پراگ اور بڈاپیسٹ کے نائٹ کلبوں میں گھوما کرتے ہیں اور جہاں کوئی اپنے مقصد کے لائق عورت نظر آئی اس پر ڈورے ڈالنا شروع کردیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ مقامی اخبارات میں جھوٹی نوکریوں کا اشتہار دیتے ہیں اور اس طرح عورتوں کو مغرب میں لاکر فروخت کردیتے ہیں۔ حال ہی میں پولینڈ میں پولیس نے ایک شخص کو گرفتار کیا ہے جس نے ۲ سو عورتیں ہالینڈ اور جرمنی ارسال کی تھیں، جن میں سے کچھ تو ۱۶ سال سے کم عمر کی تھیں۔ اندازہ ہے کہ ان سب کو جسم فروشی پر مجبور کیا گیا ہے۔

اکثر لڑکیاں جو ایسے مجرموں کے ہتھے چڑھتی ہیں، معاشی طور پر پریشان اور بھولی بھالی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض کو علم ہوتا ہے کہ انہیں طوائف کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ لیکن انہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ انتہائی بری حالت میں انہیں کام کرنا پڑے گا یا یہ کہ ان کی آزادی چھین لی جائے گی۔ اکثر کو یہ کہہ کر مغربی یوروپ لایا جاتا ہے کہ وہاں انہیں ڈانسر یا ماڈل کے طور پر کام کرنا ہوگا لیکن ان کے ساتھ زنا بالجبر کیا جاتا، ان کی پٹائی کی جاتی اور کسی طوائف خانے کی کال کوٹھری میں جسم فروشی کرنے پر مجبور کردیا جاتا ہے۔

یوکرین کی ایک ۱۹ سالہ عورت جو اس جنجال میں پھنس گئی ہے اور جس کا نام اولگا ہے کہتی ہے کہ اسے ایک اچھی نوکری کے بہانے لایا گیا اور پھر طوائف خانے میں ڈال دیا گیا۔ اسے روزانہ ۱۸ گاہکوں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے: "میں اپنی آنکھیں بند کرلیتی ہوں اور تکلیف کو بھول جانے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ میں اس سے لطف اندوز ہورہی ہوں اور ہمیشہ خود سے یہ کہتی ہوں کہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ میں نے بارہا سوچا کہ یہاں سے چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن ہر بار میرا باس منالیتا ہے۔"

اولگانے مزید کہا: "ہر گاہک کو میں ۲۰ منٹ دیتی ہوں اور اس کے لیے مجھے ۳۰ پونڈ ملتا ہے۔ اس میں سے ۱۰ طوائف خانے کے مالک کو، ۱۰ میرے روسی دلال کو ملتے ہیں۔ اور میں جس کمرے میں چار لڑکیوں کے ساتھ رہتی ہوں اس کا روزانہ کا کرایہ ۵۰ پونڈ ہے۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ کیا میں پولیس کے پاس جاؤں؟ میرے پاس اس کام کو جاری رکھنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

ایسا نہیں کہ روس، یوکرین، اور مشرقی یوروپ کے ملکوں میں لوگوں کو اب یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کی عورتوں کو بہلا پھسلا کر مغربی یوروپ لے جاکر طوائف بنادیا جاتا ہے۔ عوام اور حکومت سب کو معلوم ہے اور بہت ساری کمیٹیاں بھی عورتوں کو باخبر کرنے کے لیے قائم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسی خواتین کی کمی نہیں ہے جو رضا کارانہ طور پر اس کام کے لیے مغربی یوروپ جانا چاہتی ہیں۔ چنانچہ بسوں میں بھر بھر کر عورتیں جرمنی اور ہالینڈ وغیرہ جارہی ہیں۔ اس کی وجہ غالبا یہ ہے کہ خود ان کے ممالک کی معاشی حالت انتہائی ابتر ہے اور گھناونے پیشے سے بھی انہیں جو تھوڑا بہت ملتا ہے وہ ان کے تصور سے کہیں زیادہ ہے۔ سوائے اخلاق باختہ پیشے میں سب کو زبردستی نہیں داخل کیا گیا ہے۔ بعض رضا کارانہ بھی داخل ہوتی ہیں تاکہ اپنی معاشی حالت سدھار سکیں۔ اس اخلاقی دیوالیے پن کا ذمہ دار کون ہے؟ غریب مشرق یا امیر مغرب یا وہ ذہنیت جو اخلاق و مذہب کو پس پشت ڈال کر اسی دنیا کے عیش و عشرت کو سب کچھ سمجھ بیٹھی ہے۔

بقیہ: پاکستان کرپشن کے دلدل میں ڈوبا ہوا ہے

پاکستان حکومت انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ کے ساتھ Structural Adjustment سے متعلق ایک معاہدہ کیا تھا جس سے پرائیویٹ سیکٹر اور تجارت کی رکاوٹوں میں کمی ہونی ہے اور ریاست کی ملکیت والی صنعتوں کو نجی ہاتھوں میں بھی دیا گیا ہے۔ تاہم شرح زر میں زبردست اضافے، فصلوں کی کم آمدنی اور بجٹ میں کمی واقع ہوجانے سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن سے ملکی معیشت کو زبردست حظرات لاحق ہیں۔ اسی کے ساتھ معاشی اصلاحات کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس سے مغرب خاص طور سے پریشان ہے۔ کیونکہ مغرب اس وقت پوری دنیا کو سرمایہ داری کی لپیٹ میں لے کر امیر تر سے امیر ترین ہونے کی فکر میں ہے۔ فریڈم ہاؤس کی پاکستان کے بارے میں پوزیشن رپورٹ شائع کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ مغرب کے تاجروں کے ذہن میں دنیا کو اپنی تابعدار منڈی بنانے کی جو اسکیم ہے اس میں پاکستان کہاں فٹ ہوتا ہے اور اس ضمن میں انہیں ابھی اور کیا اقدامات کرنے ہیں کا جائزہ لیا جائے۔

بقیہ: سیاستداں مسلم ووٹ کی خاطر فرقہ واریت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں

طاری رہے کہ بی جے پی کو اپنے موقف میں کوئی کوئی تبدیلی لانے کا موقع نہ دیا جائے۔ ان کے خیال میں بی جے پی اپنے فرقہ وارانہ موقف سے نہیں ہٹ سکتی لیکن کانگریس کی بدعنوانی اور لالو پرساد اور ملائم سنگھ کی ذات پات کی تفریق کے تمام دھبے وقت آنے پر چشم زدن میں دھوئے جاسکتے ہیں۔ اگر یہ دوغلا پن نہیں ہے تو بائیں بازو کے کامریڈ اسے کیا نام دیں گے؟ شاید ان کی لغت میں اسی کو سیکولرازم کہتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں بہتات ایسے ہی عناصر کی ہے جو اقتدار کے بھوکے ہیں اور سیکولرازم کو اپنے گناہوں کی پناہ گاہ بناتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ مذہب کی بنیاد پر رائے دہندگان کو یکجا کرلیں گے اور ملک ہمیشہ فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھتا رہے گا۔ ☆

بقیہ: فرنچ اوپن ٹینس کھیل اور حسن کا دلآویز سنگم

میں کافل نیکوف سے ہار گئے۔ وہ دراصل کافی تھکے ہوئے تھے۔ اس سے قبل وہ کئی پانچ سیٹ کے میچ جم کوریر اور ٹاڈ مارٹن کے خلاف کھیل چکے تھے۔ سچ یہ ہے کہ کافل نیکوف کے خلاف کھیلنے کے لیے جس جسمانی چستی اور ذہنی بیداری کی ضرورت تھی وہ کئی طویل میچ کھیلنے کے بعد ان کے پاس نہ رہی تھی۔ پھر بھی انہوں نے کافی اچھا کھیل پیش کیا۔

سابق نمبر ایک خاتون کھلاڑی مونیکا سیلس لوگوں کی توقعات پر پوری نہیں اتریں۔ لوگوں کو توقع تھی کہ اس بار فائنل سیلس اور گراف کے درمیان ہوگا مگر ایسا نہیں ہوا۔ دراصل اب خاتون ٹینس میں بھی پہلے سے زیادہ مقابلہ پایا جاتا ہے اور اچھے سے اچھے کھلاڑی کو بھی کسی بھی دن منہ کی کھانی پڑ سکتی ہے۔

مشہور کھلاڑی اسٹیفن ایڈبرگ کے لیے یہ آخری فرنچ اوپن تھا۔ وہ اس گرینڈ سلم کے علاوہ باقی تین یعنی آسٹریلین اوپن، ومبلڈن اور امریکن اوپن جیت چکے ہیں۔ وہ کئی ماہ تک نمبر ایک کھلاڑی بھی رہے۔ لیکن گذشتہ چند سالوں سے ان کا کھیل زوال پذیر تھا چنانچہ اب انہوں نے ریٹائرمنٹ کا فیصلہ لے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ چوتھے راؤنڈ میں ہار کر کورٹ سے باہر جارہے تھے تو تماشائیوں نے کھڑے ہوکر تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں انہیں الوداع کہا۔ بعد میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے ایڈبرگ نے کہا کہ "میری زندگی ٹینس کے بعد آسان ہے۔ میں اپنے بچوں اور بیوی کا زیادہ خیال رکھوں گا اور ان کے ساتھ مزید وقت گذاروں گا۔"

بقیہ: اب ترکی کی فضاؤں میں اسرائیلی طیارے کی چہل قدمی

حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ قبرص کے معاملے میں وہ یونان نواز امریکی پالیسی کو تبدیل کراسکے۔ ۱۹۹۰ میں یہ یہودی لابی ترکی کے اس وقت کام آئی تھی جب امریکی کانگریس میں بیسویں صدی کے آغاز میں آرمینیوں کے قتل عام پر ترکی کی مذمت کے لیے ایک قرارداد پیش ہونے والی تھی۔ اسرائیل کے یہ کہنے کے بعد کہ اس سے ان دونوں ممالک کے تعلقات خراب ہوں گے، امریکی یہودی لابی نے اس قرارداد کو پاس نہیں ہونے دیا تھا۔ ترکی اب یہ امید کررہا ہے کہ یہودی لابی ایک بار پھر اس کی مدد یوں کرسکتی ہے کہ وہ یونان نواز امریکی پالیسی کو تبدیل کرانے میں اس کی مدد کرے۔ یہ وقت ہی بتائے گا کہ ترکی کو اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

بقیہ: جرمن فٹبال کو کامیابی کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے

شکل کا ہے اور اس کا فریم سونے کا ہے۔ کنز یہ تعویذ ترکی سے لایا ہے اور اس نے تمام کھلاڑیوں میں یہ تعویذ تقسیم کیے ہیں حتی کہ کوچ اور ٹیم اسٹاف کو بھی یہ تعویذ دیے گئے ہیں۔ چیک جمہوریہ کے خلاف پہلے ہی میچ میں جرمنی کی طرف سے پہلا گول کرنے والے کرسٹین زیگی کا کہنا ہے کہ جو شخص اس تعویذ پر یقین رکھتا ہے اللہ اس کی قسمت چمکا دیتا ہے اور مجھے "چشم اللہ" پر کامل یقین ہے یہی وجہ ہے کہ پہلا گول میں نے ہی کیا ہے۔

جب کسی ٹیم کی تربیت سائنسی طرز پر ہونے کے ساتھ ساتھ عقیدے سے بھی وابستہ ہو تو اسے آسمانی بلندیوں کو چھونے سے کون روک سکتا ہے؟

یوریا کی تلخی نے نرسمہا راؤ۔ رام لکھن یادو اور ان کے اقرباء کے منہ کا مزہ خراب کردیا ہے

کیا سی بی آئی کی تحقیقات راؤ کو جیل تک لے جائیں گی؟

اگرچہ نرسمہا راؤ کی کانگریس حکومت ایوان اقتدار سے باہر آچکی ہے لیکن اس کے اسکینڈلوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ نیا اسکینڈل یوریا کھاد درآمد کرنے سے متعلق ہے جس میں ۱۳۳ کروڑ روپے کا گھپلا ہوا ہے۔ اب تک تمام گھوٹالوں میں یہ گھوٹالہ کئی اعتبار سے بے مثال ہے۔

راؤ کے دور میں جو مختلف گھوٹالے ہوئے ان میں راؤ کا بھی نام ہے اور ایک میں تو ان کے خلاف ایف آئی آر بھی درج ہے۔ کیا راؤ کے خلاف کوئی کارروائی ہوسکتی ہے اور انہیں جیل بھیجا جاسکتا ہے؟ ابھی اس سوال کا کوئی جواب دینا قبل از وقت ہوگا لیکن حالات راؤ کے خلاف ہی جارہے ہیں۔

نرسمہا راؤ کی حکومت میں لبرلائزیشن اور کرپشن ہم معنی الفاظ بن گئے۔ کبھی شکر کی خرید و فروخت کا گھوٹالہ، کبھی ارون بجلی پروجیکٹ میں رشوت لینے کا معاملہ، کبھی حوالہ کیس تو کبھی یوریا گھوٹالہ یا جھار کھنڈ ممبروں کو رشوت دینے کا معاملہ۔ الغرض نرسمہا راؤ کا پورے پانچ سال میں گھوٹالہ سب سے بڑا گرو گھنٹال تھا جو جادو کی طرح سر پر چڑھ کر بولتا رہا۔

یوریا گھوٹالہ کو چھوڑ کر سارے گھوٹالوں میں پیچیدہ راستے اختیار کیے گئے تھے تاکہ مجرموں کے فرار کے راستے باقی رہیں یا وہ آسانی سے پکڑ میں نہ آسکیں۔ لیکن یوریا گوٹالہ کا معاملہ دن دہاڑے ڈکیتی جیسا ہے۔ ہمارے ملک میں اگر آپ کوئی جائز کام کرنا چاہتے ہیں تو بیوروکریسی ہزار دشواریاں پیدا کرتی ہے۔ فائل کو ایک میز سے دوسری میز یا بغل کے کمرے تک سفر کرنے میں

☆ سمباسیوا راؤ سی بی آئی کی گرفت میں

مہینوں لگ جاتے ہیں لیکن جہاں کرپٹ لوگ ملوث ہوں یا حکومت کے پیسے کو کچھ لوگ لوٹنے کا پروگرام بنا رہے ہیں تو بیورو کریٹ فائلیں بڑی تیزی سے آگے بڑھاتے ہیں۔ یوریا گھوٹالے میں کچھ ایسا ہی ہوا۔

گذشتہ سال تیس اکتوبر کو کیمیکل اور فرٹلائزر منسٹری نے اپنا سب سے بڑا ٹنڈر کھولا۔ یہ ٹنڈر ملک میں یوریا کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ۲ لاکھ ٹن یوریا درآمد کرنے سے متعلق تھا۔ کل ۱۴ افراد نے ٹنڈر بھرے تھے۔

۳۱ اکتوبر کو سارے ٹنڈر کی جانچ پڑتال ہوئی اور ماہرین کی رائے تھی کہ ترکی کی کارسن اکسپورٹنگ کمپنی ہی واحد کمپنی ہے جسے ٹنڈر نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اور نہ ہی اس سے امید تھی کہ وہ مطلوبہ قسم کا یوریا فراہم کرسکتی ہے۔ لیکن ماہرین کی اس رائے کے باوجود کارسن کے حوصلے نہیں ٹوٹے۔ اس نے اپنے ریٹ میں خاطر خواہ کمی کردی اور جب یکم نومبر کو سارے ٹنڈر دوبارہ کھولے گئے تو کارسن کو ہی یوریا درآمد کرنے کا ٹھیکہ دے دیا گیا، کیونکہ بظاہر اس نے سب سے کم قیمت پر کھاد فراہم کرنے کی ہمت کی تھی۔

رام لکھن یادو کا بیٹا پرکاش چندر

چنانچہ ۹ نومبر کو اس ضمن میں کارسن اور نیشنل فرٹلائزر لمیٹڈ (این۔ ایف۔ ایل) کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا۔ ابھی معاہدے کی تفصیلات طے ہونا باقی تھیں کہ این ایف ایل نے ایڈوانس روپیہ دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ شروع کردیا۔ کارسن سے کوئی گارنٹی یا کریڈٹ لیٹر لیے بغیر صرف دو قسطوں میں سارا روپیہ جمع کردیا گیا۔

یکم نومبر کو حتمی طور پر ٹینڈر کھولا گیا اور کارسن کو ٹھیکہ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور اس ضمن میں ۹ نومبر کو معاہدہ ہوا۔ لیکن ٹینڈر کھولنے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر ہی یعنی ۲ نومبر کو یا یوں کہیے کہ تفصیلی معاہدے سے ایک ہفتے قبل ہی ایڈوانس رقم کارسن کو دے دی گئی۔ یکم نومبر کو کل قیمت کا ایک فیصد یعنی ۳ لاکھ ۸۰ ہزار ڈالر کی رقم اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی نیویارک برانچ سے کارسن کو دی گئی۔ بقیہ رقم جو ۳۶ ملین ڈالر سے زیادہ تھی ۱۴ نومبر کو ادا کردی گئی۔ یہ ساری رقم انقرہ میں واقع اموک بینک کے کارسن اکاونٹ میں جمع ہوئی تھی

گذشتہ جنوری میں اموک بینک نے ایس بی آئی کی نیویارک برانچ کو لکھا کہ کارسن کمیٹی کا کوئی اکاونٹ ان کے بینک میں نہیں ہے اس لیے وہ اس رقم کو قبول نہیں کرسکتے۔ جب اسٹیٹ بینک آف انڈیا نے اس صورتحال سے این ایف

☆ نرسمہا راؤ کا بیٹا پربھاکر راؤ

ایل کو آگاہ کیا تو کارسن کے ہندوستانی نمائندے ایم ساماباسیوا راؤ نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے،

باقی: صفحہ ۱۳ پر

راؤ حکومت یا گھوٹالوں کا زریں دور

سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے دور حکومت کو اسکینڈلوں اور گھوٹالوں کا زریں دور کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ کسی بھی حکومت میں نہ تو اتنے گھپلے ہوئے جتنے راؤ حکومت میں ہوئے اور نہ ہی کسی وزیر اعظم کا نام گھپلوں میں اس طرح ملوث پایا گیا جیسا نرسمہا راؤ کا۔ پھر بھی نرسمہا راؤ کے خلاف ابھی تک کوئی تحقیقات نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی کارروائی ہوئی ہے۔ البتہ جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے ممبر پارلیمنٹ کو رشوت دینے کے کیس میں ان کے خلاف ضرور ایف آئی آر درج ہوئی ہے۔ اب جب کہ وہ اقتدار سے باہر ہیں، اب بھی قانون کے شکنجوں سے دور ہیں۔ ذیل میں ان مختلف گھوٹالوں کا ہلکا سا تعارف پیش کیا جارہا ہے جن میں راؤ کا نام ملوث ہے۔

سینٹ کٹس: ـــ ۱۹۸۹ میں جب راجیو گاندھی کی حکومت تھی اور وی پی سنگھ بوفورس اسکینڈل کے نام پر حکومت کو پریشانی میں مبتلا کیے ہوئے تھے تو سینٹ کٹس نام کا ایک معاملہ سامنے آیا۔ جس میں وی پی سنگھ اور ان کے تاجر بیٹے اجے سنگھ کو ملوث دکھایا گیا۔ اس گھوٹالے میں بتایا گیا کہ ایک غیر ملکی بینک فرسٹ کارپوریشن بینک میں وی پی سنگھ کے بیٹے کا کھاتہ ہے جس میں وی پی سنگھ کے پیسے جمع ہیں۔ اس کی کاغذی دستاویزیں بھی اخباروں میں شائع ہوئی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ سارا کھیل چارسو بیسی پر مبنی تھا اور ان کاغذات پر وی پی سنگھ کے جعلی دستخط کیے گئے تھے اور اس کے پیچھے اس وقت کے وزیر خارجہ نرسمہا راؤ اور چندرا سوامی کا ہاتھ تھا

گولڈ اسٹار: ـــ آندھرا پردیش میں ایک کمپنی ہے جس کا نام ہے گولڈ اسٹار اسٹیل لمیٹڈ۔ یہ نرسمہا راؤ کے دوسرے بیٹے پربھاکر راؤ کی ہے۔ پربھاکر راؤ اور ایک شیئر دلال ہیتن دلال کے درمیان دو کروڑ روپے کا ایک سودا ہوا تھا۔ آندھرا بینک فائنانشیل سروس لمیٹڈ کے ذریعے یہ رقم ادا کی گئی۔ اس سلسلے میں انکوائری چل رہی ہے۔

ہرشد مہتہ: ـــ بدنام زمانہ شیئر اسکینڈل میں نرسمہا راؤ کا نام اس وقت سامنے آیا جب اس اسکینڈل کے کلیدی کردار ہرشد مہتہ نے سی بی آئی کی تفتیش کے دوران الزام لگایا کہ اس نے نرسمہا راؤ کو دو بڑے بڑے سوٹ کیسوں میں بھر کر ایک کروڑ روپے بطور رشوت دیے ہیں اس واقعے کے منظر عام پر آتے ہی کانگریسیوں نے ایک روزنامچہ تیار کیا اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہرشد مہتہ کا الزام بے نبیاد ہے۔ اس سلسلے میں چھان بین چل رہی ہے۔

حوالہ گھوٹالہ: ـــ حوالہ اسکینڈل کے اصل ملزم ایس کے جین نے مارچ ۹۵ میں الزام لگایا کہ اس نے نرسمہا راؤ کو دو قسطوں میں دو کروڑ چالیس لاکھ روپے دیے ہیں۔ پہلی قسط آر کے دھون اور دوسری قسط چندرا سوامی اور ستیش شرما کے ذریعہ دی گئی۔ اس معاملے میں بھی راؤ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکی۔

جے ایم ایم رشوت کیس: ـــ جولائی ۱۹۹۳ میں جب راؤ حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تو جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے شیلندر مہتو نے حکومت کے حق میں ووٹ دیا۔ بعد میں سپریم کورٹ میں ایک معاملہ درج کیا گیا اور شیلیندر مہتو نے بتایا کہ ان کو راؤ کی طرف سے رشوت دی گئی تھی تاکہ وہ حکومت کے حق میں ووٹ دیں۔ سپریم کورٹ کی ہدایت پر اس سلسلے میں نئی ایف آئی آر درج کی گئی ہے اور اس میں راؤ کا بھی نام شامل ہے۔

پیٹرول پمپ کیس: ـــ راؤ پر یہ بھی الزام ہے کہ ان کے دفتر سے حیدر آباد میں کچھ لوگوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا گیا جس میں پیٹرول پمپ کا لائسنس بھی شامل ہے اور سب سے زیادہ فائدہ سمباسیوا راؤ کو ہوا۔ یاد رہے کہ سمباسیوا راؤ یوریا گھوٹالے میں ملوث ہے اور اسی کے بیان پر رام لکھن یادو کے بیٹے اور راؤ کے بیٹے راجیشور راؤ کے سالے کو گرفتار کیا گیا ہے اور راؤ کے دوسرے بیٹے سے پوچھ گچھ ہورہی ہے۔

لکھو بھائی پاٹھک: ـــ امریکہ میں ایک غیر مقیم ہندوستانی لکھو بھائی پاٹھک کے دائر کردہ کیس پر گذشتہ دونوں چندرا سوامی اور کیلاش اگروال عرف ماما جی کی گرفتاری ہوئی ہے۔ پاٹھک نے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ جس وقت چندرا سوامی نے اس سے ایک لاکھ ڈالر ٹھگا تھا اس وقت نرسمہا راؤ بھی موجود تھے۔ راؤ نے چندرا سوامی کے سیاسی اثر و رسوخ کی تصدیق کی تھی اور سوامی کے اس دعوے کی بھی تصدیق کی تھی کہ وہ پاٹھک کو دو سرکاری ٹھیکے دلوادے گا۔

یوریا: ـــ یہ تازہ ترین اسکینڈل ہے اور اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جارہی ہے۔ اس میں راؤ کے بیٹے اور رشتے دار بھی ملوث ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام اسکینڈلوں میں سے کیا کسی میں راؤ کے خلاف کوئی کارروائی ہوگی یا وہ یوں ہی آزاد رہیں گے۔

پاکستان پر قبضہ کرکے ہندوستان ایک دن اکھنڈ بھارت بن جائے گا

گوڈسے خاندان کی دیوانگی سے بی جے پی کی دوغلی پالیسی کا رشتہ

مہاراشٹر

کے چھوٹے سے شہر پونے کے ایک گوشے میں ایک خاندان اس امید میں جی رہا ہے کہ ایک دن پاکستان پر ہندوستان کا قبضہ ہوجائے گا اور ہندوستان "اکھنڈ بھارت" کی شکل اختیار کرلے گا۔ اس خاندان کے سربراہ کا کہنا ہے کہ جس دن ایسا ہوا اس دن میرا اور میرے بھائی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوجائے گا اور میرے بھائی کی روح کو سکون مل جائے گا۔ اور پھر اس دن میں سندھ جاکر اپنے بھائی کی چتا کی راکھ سندھو ندی کی لہروں میں ڈال دوں گا۔ میرے بھائی کی یہ آخری خواہش تھی۔ اگر میری زندگی میں یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو یہ روایت میرے خاندان میں نسل در نسل چلے گی اور جب تک ہندوستان اکھنڈ بھارت نہیں بن جائے گا، میرے بھائی کی راکھ کی حفاظت جان سے بھی بڑھ کر کی جائے گی۔

یہ خاندان ہے گاندھی کے قاتل ناتھورام گوڈسے کے بھائی گوپال گوڈسے کا۔ جو کہ گاندھی کے قتل کی سازش میں ۱۴ برس کی جیل کاٹ چکا ہے اور ہندو مہاسبھا کے حلقے میں جس کی زبردست پذیرائی ہے۔ ہندو مہاسبھا کے نظریہ ساز ویر ساورکر کا بھتیجہ وکرم ساورکر بھی اسی امید میں جی رہا ہے کیونکہ وہ بھی گاندھی کے قتل کی سازش میں شریک تھا البتہ اس کے رول کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ یکم جون کو پونے میں ہندو مہاسبھا کے جلسے میں گوپال گوڈسے نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ "گاندھی کی زندگی کا ایک ایک دن ہندوستان کے لیے نقصان دہ تھا وہ ایسا بوجھ تھا جسے ختم ہوجانا ہی چاہیے تھا۔ وہ بابائے قوم تھا لیکن ملک کو تقسیم کرنے کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔"

آر ایس ایس، شیوسینا، ہندو مہاسبھا اور بی جے پی۔ یہ لوگ ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ہیں لیکن ہندوستانی سیاست کی مجبوریوں کے پیش نظر یہ لوگ علیحدہ علیحدہ پلیٹ فارم سے اپنی بات کہہ رہے ہیں۔ بنیادی طور پر ہندو مہاسبھا اور بی جے پی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن ۱۹۹۱ کے اسمبلی الیکشن میں بی جے پی کے ایک امیدوار کے جلسے میں بال ٹھاکرے نے ناتھورام گوڈسے کی ستائش کی اور اس کی "خدمات" کا اعتراف کیا تو بی جے پی نے فوری طور پر خود کو اس بیان سے لاتعلق کرلیا اور کہا کہ ہمارا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

☆ گوپال گوڈسے اپنی بیوی اور ناتھورام گوڈسے کی تصویروں کے ساتھ

لیکن شرد پوار نے یہ کہہ کر ان لوگوں کی قلعی کھول دی کہ ان کے ہونٹوں پر رام مگر دل میں ناتھورام ہے۔ یکم جون کی تقریب میں بھی شیوسینا اور بی جے پی کے لیڈروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ شیوسینا کے ممبران نے کہا کہ ہم ذاتی طور پر اس میں شریک ہوئے تھے اور ٹھاکرے اس کو برا نہیں مانتے۔

جب کہ باجپئی نے بمبئی میں بیان دیا کہ بی جے پی کا اس تقریب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ہندو مہاسبھا کے سابق صدر وکرم ساورکر کا کہنا ہے کہ "بی جے پی دراصل دوہری پالیسی رکھتی ہے۔ اس کے لیڈر جو کہتے ہیں مطلب اس کے برعکس ہوتا ہے اور وہ جو کہنا اور کرنا چاہتے ہیں بیان اس کے الٹا دیتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ بی جے پی کو ہندو مہاسبھا یا آر ایس ایس کے علاوہ بہتر ڈھنگ سے کون جان سکتا ہے؟ ساورکر نے یہ بتا کر بی جے پی کے رخ سے نقلی نقاب کھینچ دی ہے۔ وہ بی جے پی جو ابھی گذشتہ دنوں تک مرکز میں حکومت پانے کے لیے "سیکولر" ہوگئی تھی اور ہندوتو کے تمام موضوعات کو اس نے ترک کردیا تھا۔ لیکن ساورکر کے بیان کی روشنی میں دیکھیں تو حقیقت اپنے آپ سامنے آجاتی ہے۔

نظام حیدرآباد اپنی سابقہ بیوی سے ہار گئے تو دیوالیہ ہوجائیں گے

نظام

حیدرآباد کی تیسری بیوی مانولویا اونور نے حیدرآباد کی عدالت میں نظام کے خلاف مقدمہ قائم کردیا ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ انہیں اور ان کی پانچ سالہ بیٹی نیلوفر کو نان نفقہ دیا جائے اور چران پیلس اور اوٹی کے سیڈار پیلس کا اسٹیٹس کو برقرار رکھا جائے اور ان کے اور پرنس مکرم جاہ کے درمیان ہوئے معاہدے کے بموجب ان دونوں عمارتوں کا حق ملکیت انہیں دیا جائے۔ عدالت نے پرنس مکرم جاہ کے وکیل سے کہا ہے کہ اس تنازعہ سے متعلق تمام کاغذات جو خاندانی عدالت میں ہوئی کارروائی سے متعلق ہیں۔ عدالت میں پیش کئے جائیں اور جب تک یہ معاملہ زیر سماعت ہے ان دونوں عمارتوں کو جوں کا توں رکھا جائے اور ان میں سے ایک بھی شے ادھر سے ادھر نہ ہو۔

مانولویا اونور ترکی کی باشندہ ہیں۔ وہ دو بار ترکی کی خوبصورت ترین دوشیزہ یعنی مس ترکی رہ چکی ہیں انہیں یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انہوں نے عالمی خواتین کانفرنس میں پہلی بار ترکی کی نمائندگی کی تھی۔ ان کی شادی پرنس مکرم جاہ سے ۱۹۹۰ میں ہوئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جس وقت یہ شادی ہوئی تھی پرنس دوسری بیوی کی ایڈز سے موت کے سبب بہت پریشان تھے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ پہلے بھی دو شادیاں کرچکے ہیں۔ شادی کے وقت جو معاہدے ہوئے تھے ان پر انہوں نے عمل نہیں کیا اور معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک اور شادی کرلی کافی ہنگامہ مچایا اور نتیجے میں نظام نے اسے طلاق دے دی۔ لیکن دوسرے معاہدوں پر انہوں نے عمل نہیں کیا۔

خاندانی ذرائع کا کہنا ہے کہ مانولویا استنبول میں تھیں کہ اس وقت ۹۴ میں نظام نے انہیں طلاق دیدی تھی۔ لیکن انہوں نے ۱۹۹۵ میں اس سے رجوع کرلیا تھا۔ لیکن اس سال انہوں نے ایک معاہدہ کرکے انہیں پھر طلاق دے دی معاہدہ یہ تھا کہ مانولویا کو پرنس کی موت کے بعد مہر کی رقم کے عوض، لاکھ ڈالر دیے جائیں گے اور ان کی بیٹی نیلوفر کو چران پیلس اور سیڈار پیلس ملے گا۔

لیکن معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہوں نے اوٹی کے سیڈار پیلس کو ۲ کروڑ ۲۵ لاکھ میں فروخت کردیا۔ ذرائع کا یہ بھی کہنا ہے کہ چران پیلس کے ملازمین نے وہاں کی اشیا کو ادھر ادھر کرنا شروع کردیا۔ اس پر مانولویا استنبول سے حیدرآباد آگئیں اور خاندانی عدالت میں مقدمہ قائم کردیا جس پر عدالت نے پیلس کے تمام ۴۴ کمروں کو بند کرنے کا حکم دیا لیکن نظام کی درخواست پر چند کمروں کو کھولنے کی اجازت دے دی۔ تاج گروپ آف ہوٹل کے ہاتھوں اپنے دو پیلس نظام پہلے ہی گنوا چکے ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں محل بھی ان کے قبضے سے نکل جائیں گے۔ اس طرح نظام حیدرآباد دیوالیہ ہونے کی دہلیز پر پہنچ گئے ہیں۔

مانولویا اونور نظام حیدرآباد کے ساتھ

اسے مت پڑھئے

ہالہ

جیوٹیس فیریٹا اینڈ فیریٹا، امریکی شہر مین ہٹن میں واقع ایک اشتہارات کی ایجنسی ہے۔ حال ہی میں اس کے صدر اور انتظامی امور کے چیف جارج فیریٹا نے اعتراف کیا ہے کہ جب ۲۴ سال قبل وہ اپنی بیوی کو رام کرنے یا شادی کے لیے راہ پر لانے کی کوشش کررہے تھے تو انہوں نے اس سے کہا تھا کہ ان کا پچ کا نام الگون کوئن ہے۔ اسی طرح ان کے دوسرے متعلقین کا درمیانی نام ایروکوئیں، ڈکوٹا اور موہاک ہے۔ "اس طرح میں خود کو اپنی ہونے والی بیوی کے سامنے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کررہا تھا۔" فیریلا نے کہا، سچ یہ ہے کہ مذکورہ القاب میں کوئی بھی صحیح نہیں ہے اور جاننے کے بعد میری بیوی نے اس کی اچھی قیمت وصول کی ہے۔ وہ جب بھی کسی معاملے میں یا میری کسی بات پر شبہ کرتی ہے تو پوچھتی ہے ڈارلنگ یہ الگون کوئن تو نہیں ہے؟

اس معاملے میں فیریٹا تن تنہا نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۹۰ فیصد امریکیوں نے ہوائی جہازوں پر اجنبیوں سے ملاقات کے دوران غلط فون نمبر دیا یا اپنی شخصیت سے متعلق غلط اطلاعات دی ہیں۔ یہ بات اس وقت منظر عام پر آئی جب ایک کتاب جس کا نام ہے "کیا آپ نارمل ہیں" کے لیے ایک قومی سروے کیا گیا۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ اس ملک میں جہاں جارج واشنگٹن کی ایمانداری کی قسمیں کھائی جاتی ہیں ۹۱ فیصد لوگوں کو اعتراف ہے کہ وہ ہمیشہ سچ نہیں بولتے۔ بیس فیصد لوگ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا کوئی بھی دن دیدہ و دانستہ سفید جھوٹ بولے بغیر نہیں گزرتا۔ سفید جھوٹ، سیاہ جھوٹ اور بڑی بڑی ڈینگیں، یہ سب امریکی روایت کا حصہ ہیں لیکن بقول کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ماہر سماجیات ایلن ڈنڈ حال میں یہ روایت کچھ زیادہ ہی بلندی کی طرف مائل پرواز رہی ہے۔

جارج واشنگٹن اس اعلان سے صدر منتخب ہوگئے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جمی کارٹر سے جب یہ سوال پوچھا گیا تو انہوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور بل کلنٹن کا دعوی ہے کہ جھوٹ بولنا تو درکنار انہوں نے اسے اپنی سانس کے ذریعہ بھی اندر نہیں کیا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اب پہلے سے زیادہ جھوٹ، غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کے قائل ہوگئے ہیں۔ اب تو لوگ اپنے بچوں کو بھی جھوٹ بولنے کی ہمت افزائی کرتے ہیں خاص طور سے جب وہ ان کی جا و بیجا تعریفیں کرتے ہیں۔ "تم بڑے عظیم ہو" یہ عام سماجی جملہ ہے جو بلا سوچے سمجھے ہر ایک کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ ماضی میں لوگ جھوٹ بولنا اخلاقاً غلط تصور کرتے تھے مگر آج ۴۵ فیصد امریکی ایسا نہیں سوچتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج امریکی سماج کے ہر شعبے جھوٹ، غلط بیانی، حقائق پر پردہ پوشی، بیجا تعریف اور مبالغہ آمیزی فیشن یا وبا کی طرح پھیل گئی ہے۔ یہ فیشن ہے اگر آپ جھوٹ بولنا غلط نہیں سمجھتے اور یہ وبا ہے اگر غلط بیانی آپ کے نزدیک ایک اخلاقی برائی ہے

پوری دنیا پر جادوگری اور سحر طرازی کی متوازی حکومت قائم ہے

سیاست۔ تجارت۔ محبت اور کھیل کے میدانوں میں ٹونے ٹوٹکے کی کارفرمائی کی حیرت انگیز داستان

خواہشات

انسان کو اندھا کر دیتی ہیں۔ دوسروں کو نقصان پہنچا کر بھی وہ ان کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے دعا تعویذ، ٹونا ٹوٹکا، سحر اور سفلی اعمال سے بھی باز نہیں رہتا۔ یہ رجحان لوگوں کے کسی ایک طبقہ تک ہی محدود نہیں بلکہ ایک طالب علم سحر کے زور سے دوسرے طالب علم پر سبقت پانا چاہتا ہے تو کھلاڑیوں کی ایک ٹیم اپنی حریف ٹیم کو شکست دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اہل فن اور اہل سیاست یعنی مصوروں اداکاروں اور افسروں میں بھی مسابقت اسی کے سہارے چلتی ہے جنہیں اس کا پورا یقین ہوتا ہے کہ اگر انہیں ان کے مقاصد میں ناکام یا کامیاب کرنے والی کوئی طاقت ہے تو وہ سحر ہے۔

کھیل کے میدان میں سحر پر اعتقاد کا حاصا عمل دخل براعظم افریقہ میں اپنی مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً ۱۹۸۰ میں سیول اولمپک کے سلسلے میں مراقش اور آئیوری کوسٹ کی ٹیموں کے درمیان مقابلہ تھا۔ کھیل کے دوران تماشائیوں نے یہ بھی دیکھا کہ اچانک مراقش کا ایک صحافی آہستگی سے مخالف ٹیم کے گول کیپر تک گیا اور اس پرس کو اچک لیا جو اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور جب اسے کھول کر دیکھا تو اس میں چند مری ہوئی چڑیاں تھیں اور ساتھ میں کچھ تعویذ رکھے تھے۔ اب یہ ہوا کہ مراقشی ٹیم کے بعض حامیوں نے اس پر پیشاب کیا تو بعض نے اثرات بد کو زائل کرنے کے لیے سورہ فاتحہ کا ورد کیا۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مراقشی ٹیم نے بڑی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد جب میچ جیت لیا تو پھر اس کی طرح طرح سے تاویلیں کی جانے لگیں کہ اگر مخالف ٹیم نے سحر نہ کروایا ہوتا تو فتح مندی اور بھی آسان ہوتی۔ تاہم یہ پر صعوبت کامیابی بھی اسی وجہ سے ممکن ہوئی کہ جادو کا بروقت توڑ کر دیا گیا تھا۔ اسی موقع کے حوالے سے روزنامہ المنتخب کے مدیر بدرالدین ادریسی جو مراقشی ٹیم کے ہمراہ وہاں گئے تھے بیان کرتے ہیں کہ کھیل شروع ہونے سے پہلے بعض لوگ اپنے جسموں پر عجیب طرح کے رنگ و روغن مل کر اور چہرے کو مختلف پٹیوں سے سجا کر میدان میں نمودار ہوئے۔ اسی طرح ایک بار ٹیم کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے میدان کا چکر لگاتے ہوئے اس کے کناروں پر کوئی بدبودار چیز چھڑکی۔ اس کے بعد ٹوگو قبیلے کی ٹیم کے افراد جب میدان میں اترے تو شگون کے طور پر وہاں خنزیر کاٹا۔ بدرالدین ادریسی کھیل کی ٹیموں کے ساتھ افریقہ میں کئی جگہوں پر جاچکے ہیں اور عام مشاہدہ ان کا یہ رہا ہے کہ مخالف ٹیم کا کوئی شخص کھیل شروع ہونے سے پہلے کچھ پڑھ کر گول کی طرف پھونکتا ہے۔ ایک اور منظر انہوں نے اس طرح بیان کیا کہ ایک ٹیم کے افراد دائرے کی شکل میں کھڑے ہوگئے پھر ان میں سے ایک شخص نکل کر وسط میں آ کھڑا ہوا اور پیشاب کرنے لگا۔ مدیر موصوف کا بیان ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ کھیل کود کے شعبے میں جادو اور سحر کا رواج صرف ساحل عاج اور قریبی علاقوں تک محدود ہے بلکہ خود مراقش میں بھی بعض ایسے قبائل موجود ہیں کہ ان کے افراد جب کہیں میچ کھیلنے جاتے ہیں تو ایسی ہی سحر طرازیاں کرتے ہیں جن میں قابل ذکر ان کا وہ عقیدہ ہے جس کے تحت وہ کوئی جانور ذبح کر کے اس کا خون گراؤنڈ کے چاروں کونوں پر چھڑک کر فتح کے دیوتا کو خوش کرتے ہیں یا اس گراؤنڈ میں موجود اپنی ٹیم کے لیے نحس اور ناگوار عناصر کا ازالہ کرتے ہیں۔ یہ تو عام سی بات ہے کہ میچ کے مقصد سے کہیں باہر نکلنے سے پہلے کھلاڑی کسی بزرگ یا اپنے عزیزوں کی قبروں پر جاکر خیر و برکت کی دعا مانگتے ہیں تاکہ وہ کامیاب و بامراد واپس لوٹیں۔

۱۹۸۰ میں سیول اولمپک کے سلسلے میں مراقش اور آئیوری کوسٹ کی ٹیموں کے درمیان مقابلہ تھا۔ کھیل کے دوران تماشائیوں نے یہ بھی دیکھا کہ اچانک مراقش کا ایک صحافی آہستگی سے مخالف ٹیم کے گول کیپر تک گیا اور اس پرس کو اچک لیا جو اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور جب اسے کھول کر دیکھا تو اس میں چند مری ہوئی چڑیاں تھیں اور ساتھ میں کچھ تعویذ رکھے تھے۔ اب یہ ہوا کہ مراقشی ٹیم کے بعض حامیوں نے اس پر پیشاب کیا تو بعض نے اثرات بد کو زائل کرنے کے لیے سورہ فاتحہ کا ورد کیا۔

ایسے فنکاروں، ایکٹروں اور مصوروں کی بھی تعداد خاصی ہے جو اماموں، کاہنوں اور جادوگروں سے دن رات رجوع کرتے رہتے ہیں خواہ وہ اپنی بعض نفسیاتی مشکلات پر قابو پانا ہو یا عزت و شہرت کی للچ میں کسی ہم پیشہ کا دھندہ چوپٹ کرنا ہو، کسی شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے علیحدہ کرانا ہو کیوں کہ حسد اور انتقام کا جذبہ بار بار انہیں ایسا کرنے پر اکساتا ہے۔

اس ضمن میں مصری پولیس کی فراہم کردہ ایک رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ ساحری کے الزام میں جن افراد کی گرفتاری اب تک عمل میں آئی ہے انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ انہوں نے ان لوگوں کے ساتھ انسان سوز اعمال کا ارتکاب کیا جو اپنی غرض سے اندھے ہو کر ان کے پاس حاجت روائی کے لیے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عورتوں کے جسم پر بعض ناقابل فہم عبارتیں اور منتر لکھنا۔ جادو ٹونے کروانے کا کام اس رپورٹ کے مطابق مصر میں کس قدر مہنگا ہو گیا ہے اس کا اندازہ حال ہی میں پولیس کی حراست میں آنے والے ایک ساحر کے اعتراف سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشے سے بیس سے ۵۰ ہزار ڈالر کماتا ہے کیونکہ اس کے گاہکوں میں ٹاپ کلاس کے تاجر، لیڈر، فلمی ہیرو اور ہیروئنیں، گلوکارائیں ہیں۔ ان کی فیس ادا کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس طبقہ کی ہوس پرستی نے اس ساحر کی دولت میں اتنا اضافہ کیا کہ چند سالوں میں اس نے ۳۰ ملین ڈالر جمع کر لیے۔ آج وہ آٹھ فلیٹوں، دو بلڈنگوں اور کاروں کی پوری قطار کا مالک ہے۔

سحر اور جن کے اثرات میں پڑے رہنے والوں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ ان کا سابقہ ایسے ہی تجربات سے پڑتا ہے جس سے ان کے اوہام اور وسوسے مضبوط تر ہوتے جائیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ساحروں اور عاملوں کے دام میں الجھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو بچوں کی ماں ایک طلاق شدہ عورت نے بیان کیا کہ وہ اپنے غیر شادی شدہ بھائی کے ساتھ اس کے گھر میں رہا کرتی تھی۔ بھائی ایک کمپنی میں منیجر تھا جس کا کام بہت پھیلا ہوا تھا۔ کمپنی میں وہ اپنے رفقا کار کی نظر میں بہت محترم اور عزیز تھا۔ گھر میں وہ اپنی بہن اور اس کے بچوں سے بھی بڑی محبت سے پیش آتا۔ دفعتاً یہ ہوا کہ اس کا کام سے جی اچٹ گیا۔ یہاں تک کہ وہ کمپنی کے دروازے تک جاکر وہاں سے لوٹ آتا۔ اس کے افسران بالا نے بہت انتظار کیا کہ شاید وہ واپس آجائے اور اسے کام پر جانے کی طرح طرح سے ترغیبات بھی دیں۔ جو سہولتیں ممکن تھیں اسے فراہم کی گئیں۔ لیکن کوئی کوشش کام میں اس کی دلچسپی بحال کرنے میں کارگر نہ ہوئی۔ لوگوں کو بہت شاق گذرا ایک شخص کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے مفلوک الحال ہو گیا۔ آخر اس نے گھر چھوڑ دیا اور کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے اپنی ضروریات پوری کرتا رہا۔ پہلی سی فراغت اس کے لیے خواب ہو گئی۔ اس بارے میں جب کسی عامل سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے سحر بتایا۔

اسی طرح ایک اور صاحبہ جن کا نام زینب ہے کہتی ہیں کہ ان کے یہاں ایک نوجوان رہتا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ آج کل بے روزگاری کس قدر ہے وہ کسی ملازمت پر ایک یا ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ تک ٹکتا ہی نہ تھا۔ وہ کام بھی خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ لوگوں کی رائے اس کے بارے میں بہت اچھی تھی حسن اخلاق اور حسن عمل کے تصدیق نامے اس کے پاس تھے۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ تم نے کام کیوں چھوڑ دیا تو بس یہی جواب دیتا کہ میرا وہاں جی نہیں لگتا۔ آخر اسے ایک عامل کو دکھایا گیا تو اس نے یہ بتایا کہ لڑکے پر سحر کیا گیا ہے۔

سحر کا اثر اتارنے والے اور "عمل" کرنے والے لوگوں کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ بعض سیاہ پوش ہوتے ہیں اور بعض سبز پوش اور گردن میں بڑے پتھروں اور منکوں کی مالائیں بھی پہنے رہتے ہیں۔ انگلیوں میں طرح طرح کی انگوٹھیاں بھی ہوں گی۔ کوئی قرآنی آیات پڑھ کر جھاڑ پھونک کرتا ہے تو کوئی لکھ کر تعویذ دیتا ہے اور پلانے کو کہتا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو آیات قرآنی میں تصرفات کر دیتے ہیں اور ان میں بعض الفاظ کی کمی بیشی اور الٹ پھیر کر کے پڑھتے یا لکھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اسی میں سحر شکن تاثر کا راز ہے۔ کسی مسحور کو عود اور لوبان کی خوشبو میں بسائے ہوئے پانی سے مختلف اوراد کے پڑھنے کے دوران غسل دیا جاتا ہے۔ کسی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ پہلے وہ قبرستان کا چکر لگا آئے اور اس کے بعد اگربتی سلگا کر غسل کی جگہ پر لگائے اور پھر غسل کرے۔ ان اعمال کا سحر کے اثرات کے ازالے سے کیا تعلق ہے یہ وہی لوگ جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک سحر کی بھی قسمیں ہیں یعنی ایک وہ جس کا سبب جن ہو اور دوسرا وہ جس کا سبب شیطان ہو اور کہا جاتا ہے کہ انسانوں کی طرح جناتوں میں بھی اچھے اور برے ہوتے ہیں۔ جنوں کا علم رکھنے والے ایک عالم نے ان کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے احوال کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلامی تحریک کو جنوں کی دنیا میں زیادہ فروغ حاصل ہو رہا ہے اور ان کے درمیان اس تحریک کا آغاز ۱۹۷۰ کی دہائی میں اٹلی سے ہوا ہے۔ اب یہ تحریک فرانس، اسپین اور جرمنی ہوتے ہوئے پورے یوروپ کو اپنے دائرے اثر میں لینے والی ہے۔ اگرچہ اٹلی کے جن اصلاً مسیحی تھے لیکن وہاں کے انقلابات نے تیزی سے انہیں اسلام کی طرف مائل کیا ہے۔ سیاست سے ان کا کوئی سروکار نہیں لیکن چونکہ بڑے افسران اور سفارت کار ان کے پاس آتے رہتے ہیں اس لیے ان کی بعض مشکلات کا حل نکالنا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک سفیر کی بیٹی اس کی گذشتہ جائے ملازمت سے خوش نہیں تھی اس نے وہاں سے تبادلہ چاہا۔ کوئی سبیل نظر نہیں آرہی تھی۔ لہٰذا جن نے اپنی قوت سے وزارت داخلہ میں اس سفیر کی فائل میں ایسے اندراجات کر دیے کہ اس کے پسندیدہ تبادلے کے آرڈر اگلے روز جاری ہو گئے۔

جنوں کا علم رکھنے والے ایک عالم نے ان کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے احوال کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلامی تحریک کو جنوں کی دنیا میں زیادہ فروغ حاصل ہو رہا ہے اور ان کے درمیان اس تحریک کا آغاز ۱۹۷۰ کی دہائی میں اٹلی سے ہوا ہے۔ اب یہ تحریک فرانس، اسپین اور جرمنی ہوتے ہوئے پورے یوروپ کو اپنے دائرہ اثر میں لینے والی ہے۔ اگرچہ اٹلی کے جن اصلاً مسیحی تھے لیکن وہاں کے انقلابات نے تیزی سے انہیں اسلام کی طرف مائل کیا ہے۔

وقت کی سوئی چھ صدی پیچھے چلی گئی، غر

مسلم اسپین کے احیاء کی تحریک سے غلہ

اسپین جہاں مسلمانوں نے ۷۱۱ء سے ۱۴۹۲ء تک حکومت کی اور پھر زوال پذیر ہوئے تو ۱۶ویں اور ۱۷ویں صدی میں ان کا وہاں سے بالکلیہ خاتمہ کر دیا گیا۔ وہ یا تو جلاوطن کر دیے گئے یا پھر زبردستی انہیں عیسائی بنالیا گیا۔ لیکن امسال ۱۹ اپریل کو وقت کی سوئی چھ صدیاں پیچھے چلی گئی جب وہاں ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے وقت مسلم اسپین کو ازسرنو تخلیق کرنے کی کوشش کی گئی۔

قدیم غرناطہ کا ایک منظر ——— مسجد کی تعمیر اسی مقام پر ہوگی

غرناطہ مدت دراز تک مسلمانوں کے اقتدار کا مرکز رہا اس کا سقوط ۱۴۹۲ میں ہوا۔ کچھ سالوں بعد نہ صرف اس شہر بلکہ پورے اسپین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ لیکن بفضلہ تعالی اب اسلام وہاں دوبارہ زندہ ہو رہا ہے۔ عرب طلبہ وہاں کثیر تعداد میں زیر تعلیم ہیں۔ اور وہاں کے اصل باشندے بھی بڑی تیزی سے اسلام کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ ان نومسلموں میں وہ لوگ بھی ہیں جو خود کو قدیم عربوں کی اولاد کہتے ہیں جنکے آباء و اجداد کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا تھا۔ جب ان سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ ان کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ان کے آباء و اجداد عرب تھے وہ اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اصل اسپینی باشندوں کے برعکس سیاہ ہیں جس کے لیے اقبال نے اپنی ایک نظم میں چشم غزال کا کنایہ استعمال کیا ہے۔

۱۴۹۲ء میں غرناطہ کے سقوط کے بعد وہاں سے مسلمانوں کا وجود ہی نہیں ختم کیا گیا بلکہ ان کی مساجد کو یا تو چرچ بنا دیا گیا یا پھر دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ ۱۹ اپریل کو اسی شہر غرناطہ میں ایک نئی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ تقریبا دو سو مسلمان جب نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو آس

> مغربی مسلمان اشاعت اسلام کے لیے سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ اچھے مسلمان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ اسلام ہی مستقبل ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر نومسلم یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسروں کو اسلام کی طرف راغب کرے۔

پاس کے اسپینی باشندوں نے اپنی چھتوں سے اس روح پرور منظر کو دیکھا۔ اس موقع پر مراکش، الجزائر اور ملیشیا کے سفیر بھی موجود تھے۔ غرناطہ کے میئر پروگرام کے مہمان خصوصی تھے۔ جب پروگرام ختم ہوا تو مجمع میں سے چار افراد نے اسلام قبول کرلیا جو اس کے سادہ اور سنجیدہ طریقہ حیات سے متاثر ہوئے تھے۔ ان خوش نصیبوں میں ایک روسی خاتون، دو اسپینی لڑکیاں اور ایک مرد تھا۔

اس پروگرام کو جہاں بہت سارے عورتوں اور مردوں نے دیکھا وہیں ایک ایسا خاموش تماشائی بھی تھا جو کبھی اسپین میں اسلام کے عروج و اقبال کی علامت تھا لیکن اب سیاحوں کی توجہ کا اصل مرکز ہے یعنی الحمراء، وہ محل جسے تیرہویں صدی میں محمد بن الاحمر نے تعمیر کیا تھا۔ الحمراء محل بھی ہے اور قلعہ بھی ہے۔ اس قلعے کے قریب کی پہاڑی پر رہائشی مکانات کے ساتھ ایک بازار ہوا کرتا تھا۔ نئی مسجد کے لیے جو زمین

دارالاسلام کا قیام نومسلم امریکیوں کا ایک قابل رشک کار

صحرا کے بیچ میں واقع اس مرکز کی جانب اسلام کے متلاشی کشاں کشاں چلے آر

ساتافے سے جنوب مغرب میں ایک گھنٹہ کی کار مسافت کے بعد اصل شاہراہ سے اک راستہ نکل کر شمال کی طرف جاتا ہے جو دریائے چاما کو پار کر کے ایک ایسی سرزمین میں داخل ہو جاتا ہے جہاں پہنچ کر ماورا، کا احساس ہوتا ہے۔ دریائے چاما پر سرخ پہاڑیاں جھکی ہوئی سی لگتی ہیں اور ہڈیوں تک سرایت کر جانے والی ہوائیں ہر نظر آنے والی چیز کو ایک مفہوم اور پاکیزگی عطا کرتی ہیں۔ دریائے چاما سے تھوڑا اور آگے جانے کے بعد فضا میں محسوس ہونے والی روحانیت ایک عملی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر آپ کو ایک خوبصورت مسجد نظر آئے گی اور آس پاس قرینے سے بنے ہوئے مکانات جو دراصل ان لوگوں کی ملکیت ہیں جنھوں نے یہاں ایک مختصر اسلامی بستی قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ صحرا میں آباد اس بستی کا نام دارالاسلام ہے۔ یہ بستی دراصل ایک

دارالاسلام میں نومسلم امریکی نماز ادا کرتے ہوئے

فکر اور ادارہ ہے۔ اس کا مقصد اعتدال پسندی، رواداری، تحمل اور قابل عزت بقائے باہم کو فروغ دینا ہے، حکیم آر چولیٹا اس بستی کے ترجمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اعتدال پسندی ہی ابھرتا ہوا اسلام ہے۔

گذشتہ چار سالوں سے دارالاسلام ایک تین روزہ سماجی اجتماع منعقد کرتا ہے جہاں لوگ عبادت کرتے، ایک ساتھ کھانا کھاتے، مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ کرتے اور محنت کرتے ہیں۔ گزشتہ سال ۳ سو کے قریب لوگوں نے اس پروگرام میں شرکت کی تھی۔ دارالاسلام نے نہ نفع نہ نقصان کی بنیاد پر ایک تعلیمی سنٹر بھی قائم کیا ہے جہاں وہ دو ہفتے کے دو تعلیمی پروگرام منعقد کرے گا جن میں سماجی مطالعات کے اساتذہ کو اسلامی تاریخ کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی جائیں گی۔

دارالاسلام کا آغاز ۱۹۷۹ میں بعض ان امریکیوں نے کیا جنہوں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ یہ لوگ ایک آئیڈیل اسلامی بستی قائم کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد میں ایک امریکہ میں تعلیم یافتہ سعودی تاجر نے ان کی بڑی مدد کی۔ چنانچہ ۲۵ خاندانوں نے یہاں آکر آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے تیس ہزار فٹ زمین خریدی جہاں انہوں نے اپنے لیے رہائشی مکانات کے علاوہ ایک مسجد اور کلاس روم بھی بنائے۔ لیکن بہت جلد ہی بعض خاندان یہاں سے واپس شہروں میں چلے گئے کیونکہ "دیہاتی زندگی" اور وہاں کی سخت معاشی جدوجہد انہیں راس نہیں آئی۔ سردست وہاں صرف ۸ خاندان آباد ہیں۔ والٹر عبدالرؤف ڈی کلرک کہتے ہیں کہ "ہمیں معلوم ہوا کہ انسانی آبادی بسانا کار بنانے جیسا آسان کام نہیں ہے۔" وہ مزید کہتے ہیں کہ "اس سے مایوسی بھی ہوئی اور راحت بھی ملی۔ راحت اس معنی میں کہ ہم نے سالوں وہ کام انجام دینے کی کوشش کی تھی جو ممکن نہیں تھا" ڈاکٹر ڈی کلرک بلجیم میں پیدا ہوئے اور دارالاسلام کے انتظام اور مالی معاملات کے ڈائرکٹر ہیں۔

درالاسلام اب ایک آئیڈیل کمیونٹی قائم کرنے کے بجائے سالانہ اجتماعات اور ٹیچر کورسوں پر توجہ دیتا ہے۔ دارالاسلام نے اپنی آٹھ ہزار ایکڑ زمین کا کچھ حصہ بیچ کر ایک وقف اس مقصد کے لیے قائم کر دیا ہے۔ اس ادارے کے ٹیچر کورسوں کو علمی حلقوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ یونا حداد ماسا چوسٹ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کی پروفیسر ہیں۔ انہوں نے ۱۹۹۴ میں دارالاسلام میں ایک ہفتہ گذارنے کے بعد یہ تاثر دیا کہ "آپ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہت ہی دلچسپ ہے۔" انہوں نے مزید کہا کہ امریکہ میں ۴۰ سے ۵۰ لاکھ مسلمان ہیں جن کی اکثریت مہاجرین پر مشتمل ہے۔ یہاں کے ہر چھوٹے

> دارالاسلام کا آغاز ۱۹۷۹ میں بعض ان
> قبول کرلیا ہے۔ یہ لوگ ایک آئیڈیل
> مقصد میں ایک امریکہ میں تعلیم یافتہ

بڑے شہر میں مسجد مل جائے گی لیکن اس طرح کی دیہاتی مسلم بستیاں کم یاب ہیں۔ مزید برآں دارالاسلام کے زیادہ تر باشندے سفید فام ہیں جب کہ اکثر امریکی نومسلم سیاہ فام ہیں۔ یہ نومسلم سنی ہیں اور ان کا نیشن آف اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیشن آف اسلام کو بعض لوگ ایک گمراہ اور سیاہ فام قومیت کا علمبردار طبقہ تصور کرتے ہیں۔

دارالاسلام کے ترجمان آر چولیٹا کہتے ہیں کہ سالانہ اجتماعات کا ایک مقصد مسلم نوجوانوں کو

اس شمارے کی قیمت پانچ روپے
سالانہ چندہ ایک سو روپے / چالیس امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز انٹرنیشنل
۴۹۰، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا
فون نمبر۔ ۶۸۲۷۰۱۸ -- ۶۹۲۶۰۳۰
سری نگر بذریعہ ہوائی جہاز ساڑھے پانچ روپے

ناطہ میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا

ئہ اسلام کی جدوجہد کو نئی قوت حاصل ہوگی

اسپینی مسلمانوں کے سربراہ (دائیں) اور غرناطہ کے میئر (بائیں) ایک نئے دور کا آغاز

حکومت اسپین نے دی ہے وہ اسی کے قریب واقع ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے مسلم اسپین کے عہد کے بازار کا وقتی طور پر احیاء کیا گیا جہاں روزانہ کے استعمال کی اشیاء فروخت کی گئیں۔ یہ سب اس لیے کیا گیا تاکہ عوام کو معلوم ہوسکے کہ مسلم عہد کا الحمراء اور اس کا آس پڑوس کیسا رہا ہوگا۔

غرناطہ کی اس نئی مسجد کی تعمیر اسپینی مسلمانوں کی ایک جماعت کررہی ہے۔ یہ تنظیم دراصل ان اسپینی باشندوں یا مسلمانوں کی ہے جنہوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے۔ یہ ۱۹۷۵ء میں قائم ہوئی اور اس کا موجودہ نام بھی اسپینی اسلامی جماعت ۱۹۸۳ میں رجسٹرڈ ہوا۔ اس تنظیم کے سربراہ ایک نومسلم عبدالفرید بریمیجو ہیں۔ فرید کہتے ہیں کہ "یہاں ہماری سرگرمی کا مقصد خود اپنے اور اسلام کو قائم کرنے اور یوروپ میں اسلام کی اشاعت ہے۔" انہوں نے مزید کہا کہ ان کی تنظیم نے اسپینی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے جسے علماء مدینہ نے سب سے اچھا اسپینی ترجمہ قرار دیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حکومت ان کی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتی۔ انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ ان کی جماعت

کرنے کے بعد ہر نومسلم یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسروں کو اسلام کی طرف راغب کرے۔ یہ لوگ اسلامی کتابوں کا اسپینی زبان میں ترجمہ بھی کررہے ہیں۔"

> نئی مسجد کے لیے جو زمین حکومت اسپین نے دی ہے وہ اسی کے قریب واقع ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے مسلم اسپین کے عہد کے بازار کا وقتی طور پر احیاء کیا گیا جہاں روزانہ کے استعمال کی اشیاء فروخت کی گئیں۔ یہ سب اس لیے کیا گیا تاکہ عوام کو معلوم ہوسکے کہ مسلم عہد کا الحمراء اور اس کا آس پڑوس کیسا رہا ہوگا۔

ایک امریکی پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن نے حال ہی میں "تہذیبوں کے تصادم" کا ایک نظریہ اسپین میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہے گی۔

عمر فاروق ایک فری لانس فوٹوگرافر ہیں۔ وہ اس خاص موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے اسپینی مسلمانوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "مغربی مسلمان اشاعت اسلام کے لیے سخت جدوجہد کررہے ہیں۔ وہ اچھے مسلمان بننے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ اسلام ہی مستقبل ہے۔ اسلام قبول پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آئندہ دنوں میں اسلام اور مغرب کے درمیان ایک تصادم ضروری ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک اسپینی اہل قلم کہتے ہیں کہ اندلس میں جو کچھ ہوا اس کا ایک پہلو لوگ بالکل نظرانداز کردیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ برسوں اسلام اور عیسائیت ایک ساتھ رہے اور دونوں کے ماننے والوں نے ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا۔ آج مسلم اسپین کے بارے میں ہمارے مشترکہ جذبات بہت اہم ہیں کیونکہ اس سے تصادم کے بجائے تعاون کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

●

کیا ۲۱ویں صدی میں اسلام اور مغرب کے درمیان جنگ ہوگی؟

عیسائی اور یہودی ممالک سے مسلم دنیا کے تعلقات، خدشات اور امکانات پر ہانگ کانگ کے رسالہ "ایشیا ویک" کا اداریہ

حال ہی میں ملیشیائی ٹیلی ویژن گلوبل کے حالات حاضرہ کے پروگرام میں "اسلام اور مغرب" مذاکرے کا عنوان تھا۔ تین اسکالر مسلم ممالک اور عیسائی۔ یہودی دنیا کے درمیان بڑھتے ہوئے تناؤ پر بحث کررہے تھے۔ اسی دوران ناظرین سے فون کرکے ایک سوال کا جواب دینے کی گذارش کی گئی۔ سوال تھا: "کیا ۲۱ ویں صدی میں اسلام اور مغرب کے درمیان جنگ ہوگی؟" نتیجہ یہ تھا کہ ۱۱ لوگوں نے اثبات اور صرف ۱۴۱ نے نفی میں جواب دیا۔ رائے شماری کا یہ پول بہت سے معنوں میں محدود تھا لیکن پیغام واضح تھا۔ ملیشیا ایک پرامن قوم ہے جس کے تیزی سے دولتمند ہورہے شہری اچھی طرح تعلیم یافتہ اور دنیا دیکھے ہوئے ہیں۔ سوال کا جواب دینے والوں کی اکثریت شاید وسیع الذہن، سیاسی طور پر باشعور اور معتدل مسلمانوں کی تھی۔ اور ان میں سے ایک بڑی اکثریت یہ یقین رکھتی ہے کہ مغرب سے ایک جنگ متوقع ہے۔

کیوں؟ ذہن میں تین عوامل آتے ہیں۔ تاریخ، سیاسی قیادت اور میڈیا۔ تاریخی اعتبار سے اسلام اور عیسائیت کے درمیان تعلقات اکثر اوقات خراب اور کبھی کبھار قدرے غنیمت رہے ہیں۔ اکثر بربریت کا ظہور ہوتا ہے جیسا کہ صلیبی جنگوں کے دوران ہوا، اور رومی سلطنت میں بھی، فلسطین اور ماضی قریب میں بلقان میں بھی ایسا ہی ہوا۔ تاریخی تصادم کا سب سے آخری راؤنڈ اس وقت ہوا جب حالیہ دہائیوں میں مسلم ممالک کے اثر و رسوخ میں تیل کی دولت کی وجہ سے اضافہ ہوگیا۔ ترقی یافتہ مغرب کا تیل پر انحصار ہے جبکہ ترقی پذیر مسلم دنیا کے پاس یہ وافر مقدار میں ہے۔ اس سے تناؤ بڑھا ہے۔ مغرب اور اسلام کے درمیان وسیع خلیج محض مذہبی نہیں ہے۔ مغربی ممالک میں حالیہ سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے محاذ آرائی مذہبی کم

اور اسلام اور لبرل سیکولر مغرب کے درمیان کشمکش زیادہ ہے۔

بدقسمتی سے سیاسی قائدین کی سوچ بڑی محدود ہے۔ محض حمایت حاصل کرنے کے لیے وہ نظریاتی، معاشی، مذہبی اور نسلی اختلافات کو ہوا دینا فائدہ مند پاتے ہیں۔ بہت سے یہودی۔ عیسائی لیڈر (اپنی اتباع کرنے والوں کو) ایک پاگل ملا، کلاشنکوف بردار بنیاد پرست کی امیج یا ایسے شخص کے ہیولے سے ڈراتے ہیں جس کا سر ڈھکا ہوا ہے اور جو ہاتھ کاٹتا یا عورتوں کو سنگسار کرکے ہلاک کرتا ہے۔ اسی طرح مسلم لیڈر زوال پذیر عورت پرست اباہلیان مغرب کی تصویر پیش کرتے ہیں جن کے پاس خاندانی اقدار نہیں ہیں۔ افسوس کہ مذہبی شخصیات ایسی باتوں کو تشہیر دیتے ہیں، ایک دوسرے کو شیطان بناکر پیش کرنے کی اس عادت کا اظہار اسلام اور مغرب کے درمیان کئی تصادموں سے ہوتا ہے مثلاً بوسنیا، سوڈان، چیچنیا، کشمیر، ناگورنو کاراباخ، نائجیریا، ایسٹ ٹیمر اور افغانستان۔

اس عمل کو دونوں طرف کے ذرائع ابلاغ خوب پھیلاتے ہیں۔ امریکہ کے اوکلاہاما شہر میں ایک سرکاری عمارت پر بم حملے کے بعد ایک مشہور برطانوی اخبار نے یہ سرخی لگائی کہ یہ بوچری (قصاب کی طرح بے رحمی سے کاٹنا) اسلام کے نام پر انجام دی گئی تھی۔ ایک دوسرے روزنامے نے یہ سرخی لگائی کہ "یہ خونی غسل ان اسلامی بنیاد پرستوں کی ساری علامات رکھتا تھا جو امریکہ سے نفرت کرتے ہیں۔"

"یہ سب غلط تھے جیسا کہ ملیشیائی وزیراعظم ماثر محمد نے نوٹ کیا ہے کہ "جب یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اسے انجام دینے والا کوئی مسلمان نہیں تھا، یہ حقیقت کہ بم مارنے والا عیسائی تھا، اسے نظرانداز کردیا گیا۔ اسے عیسائی دہشت گردی نہیں کہا گیا۔" دونوں مذکورہ برطانوی یا مغربی اخباروں میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کے خلاف اپنی زہرافشانی کے لیے کوئی معذرت شائع نہیں کی۔

مسلم ممالک کے اخبارات بھی اسی قسم کی جانبداری برتتے ہیں۔ گذشتہ ہفتہ ایک معتدل ملیشیائی روزنامے نے اسرائیل اور اس کے حلیف امریکہ کی لبنان میں اقوام متحدہ کی پناہ گاہ پر

باقی صفحہ ۱۳ پر

فوری اثر کرنے والی
۱۸ قوم ہیں، ۸۰ عمر کے لوگوں کیلئے
پیٹ اور معدہ کی بیماریوں میں مفید
دوا
اکسیر اعظم ڈراپ
ایس۔اے۔بی۔ بخشی کمپنی، ۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ

نامہ ہے

ے میں

ان نومسلموں سے روشناس کرانا ہے جنہوں نے بعض علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نومسلم جو گہرے سمندروں میں مچھلیوں کا شکار کرتے تھے انہوں نے اپنی محنت سے اسلامی قانون میں مہارت حاصل کرلی ہے۔ آرچولیٹا نے ۱۹۶۰ کی دہائی میں اسلام قبول کیا۔ اس وقت وہ برکلے میں کیلی فورنیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور ایک دوسرے نومسلم، جن کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا، انہوں نے انہیں متاثر کیا تھا۔ آرچولیٹا دارالاسلام کی قریبی آبادیوں میں یعنی میکسیکو کے گاؤں میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان غیر مسلموں میں انہوں نے قرآن کی ایک ہزار سے زائد کاپیاں تقسیم کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بعض لوگوں نے اسلام میں دلچسپی بھی ظاہر کی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ "اسلام ایک اندرونی انقلاب کا نام ہے۔ یہ روشنی ہے، یہ علم ہے۔ یہ حکومتوں کا تختہ الٹنا نہیں ہے۔ یہ امن ہے۔"

> امریکیوں نے کیا جنہوں نے اسلام اسلامی بستی قائم کرنا چاہتے تھے اور اس سعودی تاجر نے ان کی بڑی مدد کی۔

●

ڈھائی لاکھ بوسنیائی مسلمان کاٹ ڈالے گئے اور مغربی ذرائع ابلاغ جھوٹ بولتا رہا

سرب درندے مسلمانوں کے قتل عام میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے آپس میں ہاتھا پائی بھی کرتے

سربوں کی منہ بھرائی، مسلمانوں کی مظلومیت، مغربی پریس کی منافقت اور اقوام متحدہ و امریکہ کے رول پر ایک مغربی صحافی تیوڈورو لاکسن کی دل دہلا دینے والی رپورٹ

ایک شہر میں واشنگٹن پوسٹ کا رپورٹر پیٹر ماس مریسحہ نامی ایک ۱۵ سالہ نوجوان اور خوبصورت بوسنیائی لڑکی سے ملا جو سربوں کی "نسلی صفائی" یا نسل کشی سے کسی طرح بچ گئی تھی۔ ایک سربی جنگی لیڈر اسے اور اس کی چھوٹی بہن کو اس کے گھر سے کھینچ کر ایک محفوظ گھر میں لے گیا۔ اس نے اس کی بہن کو ایک کمرے میں پھینک دیا اور سرب گارڈوں سے کہا کہ "اس سے سوال کرو لیکن بہت زیادہ نہیں" اور ہنس دیا۔ وہ ۱۵ سالہ لڑکی مر گئی۔ مریسحہ پھر بھی خوش قسمت تھی۔ اسے خفیہ طور پر اس کی ماں کے پاس لوٹا دیا گیا۔ سربی جنگ باز اسے بھی چاہتے تھے اور اس کی تلاش میں تھے۔ بہت ساری بوسنیائی مسلم لڑکیاں اپنے تجربات بتانے کے لیے زندہ نہیں رہیں۔

بوسنیا کے جن علاقوں پر سربوں کا قبضہ ہوا وہاں مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر یا سڑکوں پر سے پکڑ کر دریاؤں کے پلوں پر لے جایا گیا جہاں ان کی گردنیں کاٹ دی گئیں اور ان کے اجسام کو دریا میں ڈھکیل دیا گیا۔ یا پھر انہیں کھلے ہوئے گڈھوں کے سامنے ذبح کیا جاتا۔ اس کے فوراً بعد

> مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر یا سڑکوں پر سے پکڑ کر دریاؤں کے پلوں پر لے جایا گیا جہاں ان کی گردنیں کاٹ دی گئیں اور ان کے اجسام کو دریا میں ڈھکیل دیا گیا۔ یا پھر انہیں کھلے ہوئے گڈھوں کے سامنے ذبح کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ان پر مٹی ڈال دی جاتی تاکہ وہ خونیں مٹی میں لت پت ہو کر موت کا لقمہ بنیں۔

ان پر مٹی ڈال دی جاتی تاکہ وہ خونیں مٹی میں لت پت ہو کر موت کا لقمہ بنیں۔ بہت سارے کنسنٹریشن کیمپوں میں سربوں نے یا تو رائفلوں کے بٹوں سے یا دھار دار ہتھوڑوں سے کھوپڑیوں کو پھوڑ ڈالا۔ انہوں نے مظلوموں کو تندوروں میں زندہ پکا بھی دیا۔ یہ کہیں زیادہ مہذب جرمنوں کی وحشیانہ نقل تھی جنہوں نے اپنے "شکاروں" کو جلانے سے پہلے کم از کم زہریلی گیس سے مار دیا تھا

سربوں نے اپنے بوسنیائی قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے چاقوؤں، قینچیوں اور سیمنٹ کے بنے ہوئے بلاکوں کا استعمال کیا یا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیا۔ یہ قیدی جنگی جوان نہیں تھے بلکہ وہ مسلمان تھے جنہیں سڑکوں سے اٹھا لیا گیا تھا۔ اور جنہیں وہ پکڑ نہ سکے تو سربوں نے ان پر طاقتور رائفلوں سے گولیاں برسائیں یا آرٹلری سے ان پر حملہ کیا اور بمباری کی۔ ۱۰ لاکھ بوسنیائی مسلمانوں میں تقریباً ڈھائی لاکھ ایک ایسی نسل کشی میں ختم کر دیے گئے جو جرمنوں کے ہاتھوں ہوئی نسل کشی سے بھی زیادہ دہشت ناک تھی کیونکہ اسے سرب سماج کے ہر شعبے اور حصے کی حمایت حاصل تھی اور مسلمانوں کو قتل کرنے کا جب انہیں موقع ملتا تو ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے وہ ہاتھا پائی بھی کر بیٹھتے۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو میرے جیسے لوگ مغربی ذرائع ابلاغ پر یقین کیے ہوئے تھے جو ہمیں یہ بتا رہے تھے کہ دونوں ہی پارٹیاں مجرم ہیں اور دونوں ہی نے ایک دوسرے کا قتل کیا ہے۔ اس نے دراصل مغرب کی کسی بھی پارٹی کی مدد نہ کرنے کی پالیسی کی تصدیق کی۔ حالانکہ غیر مسلم بوسنیائیوں کی مدد نہ کرنے کا مطلب تھا کہ بے انتہا مسلم سربوں کو انہیں قتل کرنے کی چھوٹ دے دی جائے۔

دونوں پارٹیوں کو غلط قرار دینے کی پالیسی نے بوسنیا کے خلاف ہتھیاروں کی پابندی کو حق بجانب قرار دیا۔ اور ہتھیاروں کی سپلائی پر پابندی لگانا ہی اس افسوسناک ملک کے بارے میں اقوام متحدہ کا واحد اقدام تھا۔ اقوام متحدہ نے مسلمانوں کی نسل کشی میں پر اثر طور پر حصہ لیا کیونکہ اس نے اس بات سے (دانستہ) انکار کیا کہ وہاں قتل عام ہو رہا ہے اور کیونکہ اس نے مسلمانوں کو اپنے دفاع سے روک دیا۔ ایک شہر میں تو اقوام متحدہ کے دستوں نے باقاعدہ سرچ لائٹوں کی روشنی بھاگتے ہوئے مسلمانوں پر ڈالی تاکہ سرب انہیں آسانی سے نشانہ بنا سکیں۔

سربوں کی منہ بھرائی کرنے والے ممالک کا سربراہ برطانیہ تھا۔ اس کی قیادت ایک بہت زیادہ قابل سیاستداں لارڈ اوون کے ہاتھ میں تھی جس کے نام سے وہ پلان جانا جاتا ہے جسے اوون پلان کہا جاتا ہے جس کے مطابق سربوں کو بوسنیا کے ان حصوں پر قبضہ برقرار رکھنے کا حق دیا گیا جہاں سے انہوں نے مسلمانوں کا صفایا کر دیا تھا۔ اس شخص کے بارے میں خود اس کی اپنی پارٹی کے لیڈر کا کہنا ہے کہ قدرت نے اسے ہر چیز سے نوازا ہے یہاں تک کہ اس کے پاس ایک مکمل بدمعاش ہونے کی بھی صلاحیت ہے۔

> اقوام متحدہ نے مسلمانوں کی نسل کشی میں پر اثر طور پر حصہ لیا کیونکہ اس نے اس بات سے (دانستہ) انکار کیا کہ وہاں قتل عام ہو رہا ہے اور کیونکہ اس نے مسلمانوں کو اپنے دفاع سے روک دیا۔ ایک شہر میں تو اقوام متحدہ کے دستوں نے باقاعدہ سرچ لائٹوں کی روشنی بھاگتے ہوئے مسلمانوں پر ڈالی تاکہ سرب انہیں آسانی سے نشانہ بنا سکیں۔

اقوام متحدہ کے فرینچ کمانڈر نے یہ کہہ کر قتل عام کو روکنے سے معذوری ظاہر کی کہ بلقان کی حالت ایسی ہے جہاں ہر شخص دوسرے سے خوفزدہ ہے اور جس سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ (یعنی سربوں کو مسلمانوں کا قتل عام کرنے دیا جائے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے) میڈیا نے بھی اپنی آنکھ بند کر لی۔

لیکن اس فرینچ کمانڈر نے اپنے ہم وطنوں کے مخصوص انداز میں بعد میں کچھ کیا ضرور اور اپنی غلطی کو ذرا کم کیا جب اس نے ایک محصور شہر کا معائنہ کیا جیسا کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے کیا تھا اور کچھ کیے بغیر وہاں سے واپس آ گئے تھے۔ لیکن اس کمانڈر نے جب مسلمانوں کے مایوس چہروں کو دیکھا تو اس نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور وہیں رکنے کا ارادہ کر لیا۔ اسے یہ جگہ پسند آئی اور اس نے ایک ایسی عمارت میں قیام کیا جو سب سے آسانی سے سربوں کا نشانہ بن سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر سربوں کو مزید مسلمانوں کو قتل کرنا ہے تو انہیں پہلے اسے قتل کرنے کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔

لیکن سرب جارحیت کی یوروپ نے جو منہ بھرائی کی، اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے پاس سب سے زیادہ طاقت تھی اس لیے یہ اسی کی اصل ذمہ داری تھی کہ قتل عام کو روکتا۔ لیکن پھر مظلوم یا قتل ہونے والے مسلمان تھے جو آج امریکیوں کے سب سے محبوب قابل نفرت چیز ہیں۔ آج ٹامس میک ولیعہد کے مقدمے کے معاملے میں بھی امریکہ میں یہ نظریہ پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے ہی اے او کلاہوما میں سرکاری عمارت کو بم سے اڑانے پر مامور کیا تھا۔

☆ معصوم بچے اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہوئے

ایک امریکی افسر نے امریکی بے عملی سے مایوس ہو کر استعفا دے دیا جو اس کے نزدیک بوسنیائی مسلمانوں کو ختم کرنے کے عمل میں تعاون کے مترادف تھی۔ بالآخر ایک یہودی بھی احتجاجاً چیخ اٹھا۔ مشہور ناول نگار ایلی ویزل ہولو کاسٹ میموریل کے افتتاح کے موقع پر صدر کلنٹن سے کہا کہ "برائے مہربانی بوسنیا میں نسل کشی کو روکئے" بہت خوب۔ یہودیوں کا یقین ہے کہ نازیوں کی موت کے کیمپوں میں انہوں نے انسانی تکلیف کا سارا سرمایہ ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے کسی نے ویسی تکلیف نہیں اٹھائی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سنگاپور سے نسل پرست جنوبی افریقہ تک حراست کے کیمپوں میں ہر جگہ اسرائیلی مشیر موجود ہیں (جہاں وہ تشدد کے نت نئے طریقوں کی تعلیم دیتے ہیں)

خصوصی ایلچی رچرڈ ہالبروک نے مسلمانوں اور سربوں یا ان لوگوں کے درمیان ایک امن معاہدہ کرایا جنہیں اس نے انٹرنیشنل پریس کے سامنے "چڑیلوں کے قاتل بچے" سے تعبیر کیا تھا۔ اس معاہدے نے بھی جارحیت اور نسل کشی کو انعام سے نوازا۔

پیٹر ماس کی خوفناک کتاب پڑھنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ کسی بھی امریکی ڈپلومیٹ کی میں کبھی عزت نہیں کر پاؤں گا۔ یہاں تک کہ میں نے اسی رچرڈ ہالبروک کو سی این این پر دیکھا کہ وہ امریکی سینٹ کی جاسوسی سے متعلق مخصوص کمیٹی کے کمرے کی طرف جا رہا ہے جہاں اس نے جراتمندانہ اقبال کیا کہ امریکہ نے بوسنیا کے خلاف اقوام متحدہ کی عائد کردہ ہتھیاروں کی پابندی کی خلاف ورزی کر کے غیر قانونی ہتھیاروں کی سپلائی سے دانستہ چشم پوشی کی تھی۔

تو کیا ہوا؟ اس نے اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ وہ ہتھیار ایران سے آ رہے تھے۔ جب مریض انتہائی خیال رکھنے کے وارڈ میں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو تو آپ یہ سوال نہیں کرتے کہ آکسیجن کہاں سے آئی ہے؟ ہالبروک نے کہا۔ اس نے مزید کہا کہ بوسنیا میں ایرانی عنصر غیر اہم ہے اور مستقبل میں اس کا نوٹ نہیں لیا جانا چاہیے۔

دنیا بھر میں اسلام کو غالب دیکھنے کے
آرزومند شب و روز جدوجہد میں مصروف ہیں
دنیا چہار سو تبدیلیوں کی زد میں ہے
کیا آپ اب تک اس انقلابی مشن سے واقف نہیں؟

آج ہی اس انقلابی منصوبے کا مطالعہ کیجئے جو اس ملک میں ایک نئی صبح کے قیام کے لئے ترتیب دیا گیا ہے

اسلامی انقلاب کا طریقہ کار	۱۰ روپے
خطبہ صدارت تاسیسی اجلاس	۲ روپے
ایک منصفانہ سیاسی متبادل کی تلاش	
مکمل فائل پٹنہ اجلاس	۱۰ روپے
ملی پارلیامنٹ کی ضرورت	۲ روپے
مکتوب	۲ روپے

مبلغ پچیس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر یہ کتابچے طلب فرمائیں۔

Milli Parliament
Po.Box.77, Aligarh-202002. Tel&Fax(0571)400182

سیاستداں مسلم ووٹ بینک کی خاطر فرقہ واریت کے عفریت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں

عوام کو راؤ کی چالوں سے ہوشیار کرنے والے خود وہی چال چل رہے ہیں

معاصر صحافت کے کالم میں ہم اہم موضوعات پر معروف اہل قلم اور صحافیوں کے مضامین شائع کرتے ہیں۔ یہ مضامین ہم مختلف قومی اخبارات سے منتخب کرتے ہیں۔ ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ قارئین دوسرے اخبارات کے قلم کاروں کے نظریات وخیالات سے واقف ہوسکیں۔ (ادارہ)

تحریر: جیا جیٹلی

نومبر ۱۹۹۵ میں بی جے پی کے مہا ادھویشن منعقدہ بمبئی میں ایل کے اڈوانی نے اپنے بیان میں ہندوستان کے آئین سازوں کے پیش کردہ معتبر سیکولرازم سے وفاداری کا عہد کرتے ہوئے سیکولرازم کے عناصر ثلاثہ یعنی مذہبی نظام حکومت کی تردید، بلا امتیاز مذہب وملت تمام شہریوں کے درمیان مساوات، اور ہر شہری کو مذہبی آزادی کی ضمانت پر خصوصی تاکید کی تھی۔ اس کے چند ماہ بعد یعنی مارچ ۱۹۹۶ میں سی پی ایم کے نمبودری پد کے نرسمہا راؤ حکومت کے سیاسی متبادل کے عنوان سے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طرف سے شائع دستاویز کی شکل میں دوسرا بیان سامنے آیا۔ موخر الذکر بیان میں کہا گیا تھا کہ سیکولر ریاست یا معاشرہ کا مطلب غیر مذہبی معاشرہ نہیں ہے۔ مذہب بھی باقی رہے گا اور مقدس کتابوں میں مذکور اصولوں پر اس کے پیرو کاربند بھی رہیں گے اور کوئی بھی خارجی ادارہ یا حکومت جائز مذہبی معاملات میں دخیل نہ ہوگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ مذہبی فرقوں کے رہنما اپنے مذہب کو سیاسی مقصد کے لیے استعمال نہیں کریں گے جیسا کہ آج کل ہندو مسلم، سکھ عیسائی اور دیگر فرقوں کے رہنما کر رہے ہیں۔ ذات پات سے عاری اور سیکولر ریاست و معاشرہ کا تصور کچھ ایسا ہے جس میں ریاست اور مذہب ایک دوسرے سے پوری طرح جدا رہیں گے اور تمام مذاہب کے ماننے والوں، یہاں تک کہ دہریوں کو بھی اپنے عقائد پر عمل پیرا ہونے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ۱۹۹۶ کے انتخابات کا اعلان ہوتے ہی سیاسی پارٹیوں اور ان کے حامیوں کے درمیان ایک دوسرے کو فرقہ وارانہ یا سیکولر کا خطاب دینے کا کھیل شروع ہوگیا۔ اور جب واضح ہوگیا کہ بی جے پی ہی واحد سب سے بڑی پارٹی ہے تو سی پی ایم اور اس کے حلیفوں نے ہی "کبھی کی فرقہ پرست" بی جے پی کو سیکولر خصوصیات سے متصف کردیا جو اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ چاہے وہ تیلگو دیسم کے نائڈو ہوں یا ڈی ایم کے کے کرونا ندھی ہوں اب کسی کو نہ بی جے پی سے کوئی اختلاف تھا اور نہ وہ کسی کی نظر میں اچھوت رہ گئی تھی۔ یہی بات آندھرا پردیش کے چندرا بابو نائیڈو کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے انہوں نے آندھرا پردیش میں این ٹی آر کے جانشین کے مسئلے کے پیش نظر کانگریس کی مخالفت میں ہر طرح سے زمین آسمان ایک کردیا اور یہ کہا گیا کہ اپنی پارٹی کے خلاف پڑنے والے ووٹوں کو منقسم کرنے کی غرض سے نرسمہا راؤ نے لکشمی پاروتی کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے خود کو کانگریس کے پکے مخالف کی حیثیت سے اس لیے نمایاں کیا کہ مرکز میں کانگریس مخالف حکومت میں اپنا اثر جمائے رکھ سکیں۔

ابھی ایک ماہ پہلے تک مسٹر وی پی سنگھ منتظم پریس میٹنگوں کے ذریعے جنتادل میں خود اپنے ساتھیوں کو ان کی حمایت کے حصول کی غرض سے نرسمہا راؤ کی فرقہ واریت کی چال کا شکار ہونے سے خبردار کررہے تھے۔ اب اس کے برعکس طریقہ کار اختیار کرنے کا ان کے پاس منطقی جواز کیا ہے؟ فرقہ واریت کا جو پتہ اب وی پی سنگھ پھینک رہے ہیں اس کا مقصد بھی اسی اقتدار کو حاصل کرنا تھا جس میں کانگریس کے ارادے ناکام ہوئے اور جس کی طرف سے وی پی سنگھ نے عوام کو متنبہ کیا تھا۔

☆وزیر اعظم دیو گوڑا سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ اور ایس آر بومئی کے ہمراہ

> آج ہمارے ملک میں بہتات ایسے ہی عناصر کی ہے جو اقتدار کے بھوکے ہیں اور سیکولرازم کو اپنے گناہوں کی پناہ گاہ بناتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ مذہب کی بنیاد پر رائے دہندگان کو یکجا کرلیں گے اور ملک ہمیشہ فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھتا رہے گا۔

اب کانگریس اور متحدہ محاذ دونوں کی نظر مسلم ووٹ پر لگی ہوئی ہے اور یہ بات بی جے پی کی طرف سے ہندو ووٹ کو متحد کرنے کی کوششوں کی طرح ہی قابل مذمت ہے۔ ملک کی سالمیت کی بات کرنے والے لوگ ہندوستان کے وسیع تناظر میں مسلم ووٹ بینک کی حیثیت ختم ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے اور اسی لیے بی جے پی کی شدت پسندی کو اعتدال کا رنگ دینے کی کوشش کے بجائے فرقہ واریت کے عفریت کو زندہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

بائیں بازو نے سیکولرازم کے ایجنڈے کی تشہیر کرکے خود کو ایک ایسی مستند تقسیم کرنے والی ایجنسی کا مرتبہ دے دیا ہے جو اس کا فیصلہ کرتی رہے کہ کون سیکولر ہے اور کون فرقہ پرست اور کون سا سیکولر پرست دراصل فرقہ پرست ہے اور کون سے فرقہ پرست عناصر محض سیکولر ہونے کا سوانگ بھر رہے ہیں؟ اسی بائیں بازو والوں نے مصلحت دیکھ کے بات اور موقف بدلنے کا حق بھی اپنے آپ کو دے لیا ہے۔ اٹل بہاری باجپئی کی دو ہفتے کی حکومت کے دوران عوام کو بی جے پی کی نئی اعتدال پسندانہ لہر سے ہوشیار کرانے میں یہ لوگ پوری طرح مصروف رہے ہیں تاکہ ایک ہوا کھڑا رہے اور مسلمانوں اور جمہوریت پسندوں پر ہیبت

باقی: صفحہ ۶ پر

بقیہ: کیا سی بی آئی کی تحقیقات راؤ کو جیل تک لے جائیں گی؟

رقم کو سوئزرلینڈ کے اینگلو سوئز بینک میں جمع کردیا جائے۔ لیکن اس بینک نے بھی یہ کہہ کر رقم واپس کردی کہ اسے اس نام کی کسی فرم کا علم تک نہیں ہے۔

فروری تک یہ بات طے تھی کہ اس بھاری رقم کو لینے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن این ایف ایل اور سامبا سیوا راؤ کو اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ کسی طرح رقم جنیوا کے پک ٹیٹ بینک میں جمع ہوئی اور وہاں تقریبا ایک ماہ تک رہی۔ اس کے بعد اس بات کا انتظار ہونے لگا کہ یوریا کسی طرح آئے مارچ آگیا لیکن یوریا کا ایک دانہ بھی نہ آیا۔ اب این ایف ایل اور فرٹلائزر منسٹری کو پریشانی لاحق ہوئی۔ دونوں کے نمائندے سامبا سیوا راؤ سے ملے تو اس نے کہا کہ بعض تکنیکی دشواریوں کی وجہ سے یوریا نہیں آپارہا ہے۔ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ ۲ نومبر کو کل رقم کا ایک فیصد جو ادا کیا گیا تھا وہ کارسن کو نہیں ملا۔ دراصل یہ رقم گھوم پھر کر اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی دہلی برانچ کے پاس موجود ہے اور اسے کوئی لینے والا نہیں ہے۔

مارچ۔ اپریل میں حکومت کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلی کوشش یہ کی کہ کسی طرح ۳۶ ملین زائد کی رقم واپس حاصل کی جائے۔ انہوں نے پک ٹیٹ بینک سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ ۹۱۹۲۳ اکاؤنٹ نمبر سے یہ رقم نکالی جاچکی ہے اور اب اس کا پتہ نہیں ہے۔ اب یہ بھی تقریبا طے ہے کہ یوریا کبھی بھی ہندوستان نہیں پہونچ پائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تحقیق کے بعد پتہ چلے کہ کارسن نام کی کوئی فرم ترکی میں ہے ہی نہیں۔

اس گھوٹالے کی تحقیق کی ذمہ داری سی بی آئی کے حوالے کردی گئی ہے۔ سی بی آئی نے

> ممکن ہے کہ معاملات کو بگڑتے دیکھ کر رشوت خوروں نے اپنے حصے کی رقم وصول کرنے سے انکار کردیا ہو۔

کارسن کے ہندوستانی نمائندے سامبا سیوا راؤ کو گرفتار کرلیا ہے۔ این ایف ایل کے بعض افسران بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ سابق مرکزی وزیر رام لکھن یادو کے بیٹے پرکاش چندر یادو اور سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے ایک رشتہ دار سنجیوا راؤ کو بھی گرفتار کرلیا گیا ہے۔ نرسمہا راؤ کے بیٹے پربھاکر راؤ سے بھی سی بی آئی تفتیش کرچکی ہے اور ممکن ہے آئندہ دنوں میں انہیں بھی گرفتار کرلیا جائے کیونکہ اب تک کی تحقیقات سے اتنی بات واضح ہوچکی ہے کہ پربھاکر راؤ کے دباؤ ہی کے تحت کارسن کو یوریا درآمد کرنے کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔

سی بی آئی کی تحقیق جاری ہے اس لیے کوئی تبصرہ کرنا بروقت نہ ہوگا۔ لیکن اب تک جو حالات ابھر کر سامنے آئے ہیں، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ٹھگوں کا ایک گروہ ایک جھوٹی فرم قائم کرکے بعض بااثر سیاستدانوں اور وزیروں کے بیٹوں کو رشوت دے کر ایک ٹھیکہ حاصل کرلیتا ہے۔ اس فرم نے جو رشوت دی تھی وہ تو ان لوگوں کو مل گئی۔ وہ تو ملنی ہی تھی لیکن یوریا کی ایک بوری بھی ابھی ہندوستان نہیں آئی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معاملات کو بگڑتے دیکھ کر رشوت خوروں نے اپنے حصے کی رقم وصول کرنے سے انکار کردیا ہو اور اب وہی رقم اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے ہیڈ کوارٹر میں پڑی ہوئی ہے جس کا کوئی دعویدار نہیں ہے۔

اگرچہ سی بی آئی ترکی اور سوئٹزرلینڈ بھی اپنی تفتیشی ٹیمیں بھیج رہی ہے لیکن اگر یہ معاملہ روشنی میں آسکتا ہے تو اندرونی تحقیق سے۔ یا ہوسکتا ہے کہ بوفورس اور سینٹ کیٹس تحقیقات کی طرح یہ تحقیق بھی سالوں چلتی رہے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو، کیونکہ اس گھوٹالے میں بھی سابق گھوٹالوں کی طرح بااثر لوگ ملوث ہیں۔

بقیہ: اسلام اور مغرب کے درمیان جنگ

بمباری کے لیے سخت تنقید کی اور یہ سرخی لگائی Getting Away with Murder یعنی قاتل سزایاب نہ ہوگا۔ اس مضمون میں ان میزائلوں کا تذکرہ نہیں تھا جو اسرائیل پر برس رہے تھے۔ (ایشیا ویک ایک مغرب نواز میگزین ہے اس لیے وہ یہ بھول گیا ہے کہ اسرائیل جنوبی لبنان پر غاصبانہ قبضے کیے ہوئے ہے جسے آزاد کرانے کے لیے حزب اللہ برسرپیکار ہے۔ اور پھر مغرب یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ اس نے یہودیوں کو ایک وطن دینے کے لیے لاکھوں فلسطینیوں کو بے وطن کیا ہے۔) بلاشبہ کئی ممالک میں پریس، بالخصوص ایران اور شام میں اور بھی مغرب مخالف ہیں۔

یک طرفہ اور غیر حقیقت پسندانہ رپورٹیں دراصل ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہیں جو واقعے کے ظہور سے قبل بن جاتا ہے اور جو دشمنانہ رویے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے یہ یقین ہے کہ مسلم اور مغربی سماج ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے درمیان تصادم تقریبا یقینی ہے۔ اس نقطہ نظر کی تشریح امریکی اسکالر سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنے متنازعہ مضمون "تہذیبوں کے تصادم" میں کی ہے۔

"کمیونزم کی شکست کے بعد مغرب کو ایک نئے ولن (مجرم) کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ متلون، بے اصولے اور تشدد اور دہشت گردی کے دلدادہ ہیں۔" یہ بات گذشتہ ہفتہ ملیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر ماثر محمد نے کہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ "بوسنیا، چیچنیا، فلسطین اور لبنان میں جہاں مسلمان کمزور ہیں، اسلام کے دشمنوں نے ان پر بے رحمانہ حملہ کیا ہے۔ "بہت سے مسلمان" کافر "مغرب کو ایک ایسا دشمن تصور کرتے ہیں جس کو مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔

واضح رہے کہ تصادم کا بیج نہ صرف بو دیا گیا ہے بلکہ وہ پھل پھول رہا ہے۔ کیا کرنا چاہیے؟ سیاسی قائدین کو ایسی کوششوں میں اہم رول ادا کرنا چاہیے جن کا مقصد اختلافات کی خلیج پر پل قائم کرنا اور غلط فہمیوں کو کم کرنا ہے۔ مسٹر ہنٹنگٹن تہذیبوں کو ایک ساتھ رہنے کی دعوت دیتے ہیں اور ڈاکٹر ماثر ثقافتی رشتوں کو استوار کرنے کی بات کرتے ہیں۔ پہلے قدم کے طور پر بہتر ہوگا کہ طرفین یہ پھر سے یاد کریں کہ عیسائیت یہ تعلیم دیتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی کیا جائے جو وہ چاہتے ہیں۔ دوسری اہم بات جو ذہن میں رکھنے کی ہے وہ یہ کہ اسلام کا مطلب امن ہے۔

☆☆☆☆☆

مراسلات

مسلم اکثریتی حلقوں کو آزاد کرائیے

محمد کمال الظفر صدر مونس و عبدالمنان خاں ایڈووکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ سکریٹری مونس (مسلم یونین فور نیشنل انٹیگریشن اینڈ سیکولرازم) نے حالیہ پارلیمانی انتخاب کے نتائج پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک کے ۲۰ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی، سماجی تعلیمی اور اقتصادی سطح پر پیچھے ڈھکیلنے والوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے کانگریس پارٹی کو من حیث القوم اپنا تعاون دیا جس کے بل بوتے پر یہ تقریبا ۴۰ سال تک اس ملک پر حکمرانی کرتی رہی لیکن اس نے مسلمانوں کو اس تعاون کے بدلہ میں فرقہ وارانہ فسادات، عام بدحالی اور تعلیمی پس ماندگی سے دو چار کر دیا۔ جہاں آزادی کے وقت ۳۳ فیصد مسلمان ملازمت میں تھے وہاں اب صرف ڈیڑھ فیصد رہ گئے ہیں۔

اس ملک میں مسلمانوں پر ترقی کے راستے مسدود کردیے گئے ہیں۔ پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی تعداد خطرناک حد تک کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ اس ملک کی رسیاتوں میں مسلمانوں کے ووٹ کا تناسب سب سے کم ۵ فیصد ہریانہ میں ہے جبکہ سب سے زیادہ ۹۵ فیصد لکشدیپ میں ہے۔ اتر پردیش میں ۲۰ انتخابی حلقے ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فیصد سے لے کر ۵۰ فیصد تک ہے۔ بہار میں تقریبا ۱۲ پارلیمانی انتخابی حلقے ایسے ہیں کہ اگر مسلمان بصیرت سے کام لیں تو ان کی تعداد کافی بڑھ سکتی ہے۔ یہ کتنی حیرت ناک بات ہے کہ اس سیکولر ملک میں ۵۴۳ پارلیمانی حلقے میں ۱۱۹ حلقے کو ہریجن اور شیڈول ٹرائب کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے جس میں تقریبا ۴۰ ایسی جگہیں ہیں جہاں مسلمانوں کا ووٹ دوسرے تمام فرقوں سے زیادہ ہے۔ اس معاملے پر ملک کے مسلم دانشوروں کو سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا اور ایسے تمام پارلیمانی حلقوں کو جہاں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے آزاد کرانا ہوگا۔

آفس سکریٹری۔ مونس، پٹنہ۔ بہار

ملی ٹائمز پر ایک تبصرہ

پہلے تو مبارک باد قبول کیجئے۔

اس تاریک دور میں ہم اردو دانوں کے لیے صبح صادق کی طرح آپ کا اخبار آیا۔ میں شروع سے آپ کا اخبار پڑھتا ہوں۔ البتہ کچھ عرصہ کے لیے چھٹی پر گیا تھا تو بمبئی میں کافی تلاش کے بعد مجھے باسبے سنٹرل ریلوے کے بک اسٹال سے ملا۔ واپسی کے بعد یہاں پہلے کی طرح ہر دو کان پر دستیاب نہ تھا میں نے سمجھا جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ پھر الحمد للہ۔ آپ کا اخبار ابھی بھی ملا ہے۔ ملی ٹائمز نے ہم لوگوں کو یہاں جو صلہ بخشتا ہے دعا ہے بار الٰہی اس اخبار کے ساتھ ہم مسلمانوں میں اتحاد اور عمل پیدا فرما اور اس اخبار کو اتنی عمر دے کہ تاریخ کا واحد اخبار کہلائے۔

اب میں اخبار پر تنقید کرتا ہوں ایک تا ۱۵ مئی کے شمارے کے صفحہ نمبر ۱۷ پر شادی سے متعلق سوال کا آپ نے مکمل جواب نہیں دیا ہے برائے کرم جواب پورا دیا کریں اور دعا عربی میں لکھیں ساتھ ہی حدیث کا نام جس سے نقل کی جارہی ہے وہ بھی لکھیں ہوسکتا ہے سائل ایک جواب کی خاطر حدیث لائے اور پھر اس کے علم میں اضافہ ہو مثلا آپ نے جواب میں یہ نہیں بتایا کہ مہر کی ادائیگی اولین کام ہوگا۔ اس کے اگلے جواب میں آپ نے کہا ہے کہ تین جمعہ چھوڑنے والوں کے قلب پر اللہ تعالیٰ مہر لگادیتا ہے ٹھیک ہے۔ نکلنے کا راستہ کون بتائے گا فرض آپ ہی کا ہے۔ وہ یہ کہ چوتھے جمعہ کو وہ ضرور نماز پڑھے نماز سے پہلے سچی توبہ کرے اور کلمہ طیبہ صدق دل سے پڑھ کر پھر نماز شروع کرے۔

آپ سے گذارش ہے کہ آپ اپنے اخبار میں کم از کم ایک صفحہ دین کے لیے وقف کریں جس میں اہم حدیثوں اور چند آیات قرآنی کا بھی ترجمہ ہو تاکہ سلسلہ تبلیغ جاری رہے۔ اس سے آپ بھی جواب دہ نہ رہیں گے اور ہم جیسے کافی لوگ استفادہ حاصل کرسکیں گے۔

آپ کے ٹرسٹ کے لیے اگر میں کسی کام آسکوں تو بے شک آپ مجھے حکم صادر کرسکتے ہیں۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔

کچھ اس طرح کی کاوشیں کی جائیں کہ علماء کرام ایک بار دلی طور پر خالصتا اللہ کے لیے غور کریں کہ آیا فرقہ پرستی صحیح ہے یا غلط اور اگر غلط ہے تو حکمت عملی کیا ہو کہ لوگ راہ راست پر آئیں اور بہت سی چیزیں ہم غلط ہونے کے باوجود پکڑے ہوئے ہیں خواہ وہ چیزیں وراثت میں ملی ہوں یا علماء سو کی دین ہو۔ مذہب و ملت میں جو چیزیں اضافی پیدا ہوگئی ہیں انہیں ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور ملت میں اتحاد پیدا کیا جائے انشاء اللہ کامیابی قدم چومے گی۔ بصورت دیگر بوسنیا سے براہمارا حشر ہونے والا ہے۔

عبدالقیوم۔ سعودی عرب

مفصل مضامین بھی دیں

آپ کا اخبار ماشاء اللہ پہلے سے اچھا ہے اور کافی ترقی کر رہا ہے۔ عوام میں کافی مقبول ہو رہا ہے۔ اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ابھی بھی اس اخبار میں چند خامیاں ہیں مثلا اس میں آدھے آدھے صفحات کے مضامین یا رپورٹوں کی بھرمار رہتی ہے اور تفصیلی مضامین کی کمی کھٹکتی ہے جو کہ بھرپور علمی مضامین ہوں۔ مئی ۹۶ کے شمارے میں ایک ماہر عرب مضمون نگار حسان تحسین صاحب کا مسئلہ کشمیر پر مضمون بہت ہی عمدہ تھا جس میں چند ایک ایسے قانونی نکتے اجاگر کیے گئے تھے جن پر نہ صرف لوگوں کا دھیان کم یا نہیں جاتا ہے بلکہ انہیں کو نظر انداز کرکے غاصب و ظالم بڑی صفائی سے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتا ہے۔ اردو صحافت میں ایسا عمدہ مضمون پچھلے چھ سات سال میں نہیں دکھلائی دیا۔

صلاح الدین نیل گری۔ انوشکتی نگر۔ بمبئی

مسلم جاب ریزرویشن اور اکابر ملت

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور معاشی پریشانی کے پیچھے کن عناصر کا ہاتھ ہے؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ دو اور دو چار کی طرح عیاں ہے۔

آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی کچھ سال تک ہندوستان میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ۳۰ فیصد تھے لیکن آج جب ان کی تعداد بڑھی اور حکومت کی باگ ڈور فرقہ پرستوں اور سیکولرازم کا نقلی لبادہ اوڑھے حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی تو یہی مسلمان سرکاری ملازمتوں میں گھٹ کر صرف ڈیڑھ فیصد رہ گئے۔

آزادی کے بعد ایک ایسا غیر تحریری خفیہ منصوبہ تیار ہوا جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔ سردار پٹیل نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اس حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کی حالت شودر اور ہریجن کی جیسی ہوجائے آج ایسی ہی کچھ دیکھنے کو مل رہی ہے۔ ہندوؤں کے نچلے اور کچلے طبقوں کو ریزرویشن کی سہولت فراہم کرا کے ان کی حالت تو درست کردی گئی اور مزید درست کرنے کی سعی کی جارہی ہے لیکن مسلمان آج تباہی کے غار میں لٹک رہے ہیں اور ان کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی ہے اور میاں جی کا عالم یہ ہے کہ خواب غفلت سے بیدار بھی نہیں ہوتے اگر ہوتے بھی ہیں تو اس وقت انہیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب یہ اپنے یہاں تقسیم در تقسیم کا سلسلہ قائم دیکھتے ہیں اور اندر سے یہ اتنے ٹوٹ چکے ہوتے ہیں کہ ان میں اتنی طاقت اور سکت باقی نہیں رہتی کہ زور دار آواز میں مسلم جاب ریزرویشن کا نعرہ بلند کرسکیں۔

ہر سال یوپی ایس سی کے تحت سول سروسز کے مقابلہ جاتی امتحانات ہوتے ہیں، لیکن انٹرویو میں کامیاب ہونے تک ان کی تعداد ۲۰ سے زائد نہیں ہوتی اب جب کہ پسماندہ مسلم امیدوار بھی کثرت سے حصہ لے رہے ہیں پھر بھی ان میں سے کامیاب امیدواروں کی تعداد وہی ۲۰ تک ہی رہتی ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک کوٹا ہے جو ہر سال آٹھ سو، نو سو میں سے صرف ۲۰ کے آس پاس ہی رہے۔ جب کہ منڈل کمیشن کے لاگو ہونے سے قبل بھی یہی پوزیشن تھی اور اب جب کہ منڈل کمیشن کے تحت، ۲۷ فیصد کا کوٹا نافذ کردیا گیا ہے تو ان میں سے پسماندہ مسلم امیدواروں کو ملا کر ان کی تعداد ۴۰ اور ۵۰ یا پھر اس سے زائد کیوں نہیں ہوتی؟

ایک طرف مسلم آبادی میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف ملازمتوں سے مسلمانوں کی تعداد گھٹی ہے۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز زیادہ تر غیر مسلم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آزادی سے اب تک سارے مسلمان کند ذہن، کورے اور غبی پیدا ہوئے ہیں؟ ہاں اگرچہ نمونے کے طور پر کچھ کامیاب اور اعلیٰ عہدوں پر فائز مسلم افراد دکھائی دیتے ہیں مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ سرکاری تو درکنار غیر سرکاری ملازمتوں کے لیے بھی مسلم نوجوانوں کو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں بھی مسلم نوجوانوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے۔ سول سروسز کے علاوہ پولیس، فوج، سی بی آئی اور را جیسے خفیہ محکمے میں بھی مسلمان نہیں کے برابر ہیں۔ ریزرو بینک میں ۲۰ ڈائریکٹر ہوتے ہیں جن میں صرف دو ڈائرکٹر مسلمان ہیں، سی بی آئی میں نہیں کے برابر مسلمان ہیں۔ جب کہ را جیسے خفیہ محکمے میں مسلمان صفر ہیں۔

اس سال یوپی ایس سی کے تحت سول سروسز کے مقابلہ جاتی امتحان ۹ جون کو ہوئے۔ جس میں تقریبا دو لاکھ امیدواروں نے حصہ لیا۔ جن میں تقریبا دو ڈھائی ہزار مسلم امیدوار بھی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سال کامیاب ہونے والے مسلم امیدواروں کی تعداد کتنی ہوتی ہے۔

محمد علی ظفر

پٹیانا، کلٹی۔ بردوان (مغربی بنگال)

ہندوستانی سیاست کا مکروہ چہرہ

آپ کے معزز ہفت روزہ "ملی ٹائمز" کا انتظار بہت بے قراری سے رہا کرتا ہے حالیہ شمارے میں "مرکز میں بھاجپائی حکومت کے قیام سے ہندوستانی سیاست کا مکروہ چہرہ بے نقاب، ہمارے دلوں کی ترجمانی ہے۔ آر ایس ایس حکومت کے لیے اعتماد کے ووٹ پر بحث کے دوران غیر بی جے پی ممبران میں صرف جارج فرنانڈیز نے ہندوتو کے علمبرداروں کی حکومت کی وکالت کی اور کہا جہاں سے وہ چن کر آئے ہیں وہاں بنکر مسلمان اور دست کار مسلمان ہیں لیکن ان کی خبر گیری سب سے زیادہ وقفہ تک حکومت کرنے والوں نے کبھی نہیں کی۔ گویا وہ وہاں کے مسلمانوں پر بی جے پی کی حکومت بنتے ہی نوازشوں کی بارش کردیں گے۔ انہوں نے بی جے پی کی ہی زبان میں کچھ دھمکیاں بھی دیں۔ ایک معزز ممبر پارلیمنٹ نے بجا طور پر ان سے سوال پوچھا کہ کیا وہ بابری مسجد کی شہادت کی ذمہ داری لیں گے؟ کچھ ہندو لیڈروں نے ہی ہندوتو کے علمبرداروں کی بخیہ ادھیڑ دی۔ سنگھ پریوار سے پاسوان نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا کہ آج ہر ریاست کا وزیر اعلیٰ تو ہندو ہے، کہاں ہے کوئی مسلمان؟ اس ملک کو اور کس طرح ہندو راشٹر بنانا چاہتے ہو؟ سنگھ پریوار کے پاس کیا ہے بابری مسجد توڑنے کا جواز؟ لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوتو کے علمبردار سچ ہی کب بولتے ہیں؟ بی جے پی مجرمانہ ریکارڈ کی حامل پارٹی ہے یہ سب کو معلوم ہے

دراصل یہی ہے "ہندوستانی سیاست کا مکروہ چہرہ" ایک سیکولر حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اس میں شامل ہیں۔

کمال الدین، تیتری بازار۔ سدھارتھ نگر (یوپی)

یہ اختلافات کیوں؟

آپ شاید ہی کوئی ہوش منداس حقیقت سے انکار کرے کہ اگر مسلمان تفرقہ بازی میں پڑنے کی بجائے قرآن و سنت کی روشنی میں ضابطہ حیات اپنائے رکھتے تو شرحوں اور تشریحوں جیسی طومار نویسی کی نوبت ہی نہ آتی بلکہ مسلم قوم کا کردار و عمل ہی اس کمی کو ہر دور کے لحاظ سے پورا کرتا رہتا۔ مگر افسوس صد افسوس مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوتے ہی قرآن و سنت کے ایک کی بجائے کئی کئی مفہوم سمجھے جانے لگے جس کے نتیجے میں اتحاد اور ملی یک جہتی کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا۔ نفرتیں اور کدورتیں پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ نئے نئے فرقوں نے جنم لیا۔ پیروؤں کے ذہن میں یہ حقیقت پختہ کردی گئی کہ اس اضافی لٹریچر کے بغیر قرآن پاک کے الٰہی مفہوم تک رسائی حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ان حالات میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر فرقے کے پاس اپنا اپنا قرآن و سنت ہے۔ تکلف بر طرف آج ایک مسلمان بلا جھجھک دوسرے مسلمان سے دریافت کرتا ہے کہ جناب کے زیر مطالعہ کون سے مفسر قرآن کی تفسیر ہے۔

سرخیل حضرات نے اپنے اپنے حلقہ کے مسلمانوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ جنت کے حقدار فقط وہی ہیں اس انوکھے نظریہ کے تحت سب کے سب جنتی یا جہنمی قرار پاتے ہیں۔

آج کرہ ارض پر نوع انسانی کی بڑی اکثریت کے دلوں سے رب العالمین کا خوف مٹ چکا ہے اور نہ ہی احترام انسانیت ہے۔ اجتماعیت کی بجائے انفرادیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے نوجوان طبقہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے بغیر ایک جگہ اکٹھے رہ کر جنسی تعلقات قائم کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ ان حالات سے صاف ظاہر ہے کہ شیطان کرہ ارض پر اپنے نصب العین میں کامیابی و کامرانی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ شیطان کو اس کے مشن میں شکست دینے کے لیے مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کی صورت میں نسخہ کیمیا موجود ہے لہذا جید و فاضل علماء کرام پر لازم آتا ہے کہ باہم مل کر قرآن و سنت کی روشنی میں گروہ بندی اور فرقہ واریت کو فروغ دینے والے عقائد و نظریات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ایسا متفقہ لائحہ عمل تیار کریں جس پر مسلم قوم کا ہر فرد عمل پیرا ہو کر دور حاضر کی معاشرتی، ثقافتی اور معاشی برائیوں و بد عنوانیوں کے علاوہ قبیح جرائم و افعال سے پاک معاشرہ قائم کرنے کا اہل ثابت ہو۔

محمد شکور بھٹی۔ ریاض (سعودیہ عربیہ)

ہماری ایجنسیاں

☆ ایگل نیوز ایجنسی
رائس مارکیٹ، دھارواڑ (کرناٹک)

☆ نورانی کتاب گھر
محمد کفیل احمد بک سیلس اینڈ عطر مرچنٹ
باؤنس گلی۔ کٹک (اڑیسہ)

☆ عبدالمنان
میگزین اینڈ نیوز پیپر ایجنسی
بشیر گنج۔ بہرائچ (یوپی)

☆ نوین کمار جھا
نیوز پیپر ایجنسی،
ریلوے ہاؤس نمبر 145/154 الگل پارا،
نیر در گامندر۔ مدھوپور (دیوگھر)

☆ سید شفیع اللہ
[illegible] بک ایجنسی
رحمت سائکل مرچنٹ، ایس۔ آر۔ پی روڈ
[illegible] ۵۷۱۱۰۱

☆ مظہر بک ڈپو
بی۔ ۲۶، نزد جامع مسجد، نیو سیلم پور۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۵۳

سائنٹفک تربیت اور عقیدے سے وابستگی نے

جرمن فٹبال ٹیم کو کامیابی کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے

تحریر: اجمل حسین

یورپی فٹبال چمپئین شپ کے تناظر میں

ورلڈ کپ فٹ بال کے بعد یورپی چمپئن شپ وہ فٹ بال ٹورنامنٹ ہے جس پر کم و بیش پوری دنیا کے فٹ بال کی نظریں لگی ہوئی ہیں اور یہ چمپئن شپ خاص طور سے یوروپ اور لاطینی امریکہ کے سٹہ بازوں کے لیے موسم بہار ہوتی ہے۔ لیکن چیک جمہوریہ کے ہاتھوں شکست کھا کر اٹلی نے تمام سٹہ بازوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے اور دوسری طرف ۱۹۹۶ کے عالمی چمپئن شپ کے اعزاز کا خواب دیکھنے والی اس وقت کی سب سے مضبوط ٹیم جرمنی نے راحت کی سانس لی ہے کیونکہ اٹلی اسی کے گروپ میں ہے اور ابتدائی لیگ میچ میں ان دونوں کا مقابلہ دونوں میں سے کسی ایک کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا اور ٹورنامنٹ سے باہر ہونے والی ٹیم جرمنی بھی ہو سکتی تھی مگر چیک جمہوریہ کے ہاتھوں اٹلی کی شکست نے جرمنی کے خیمہ میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑا دی ہے کہ لیگ میچ جسے فٹ بال کے پنڈت فائنل کی ریہرسل سے تعبیر کر رہے تھے اب محض ایک رسم نبھانے کے مترادف ہو گا کیونکہ اٹلی ٹورنامنٹ سے باہر ہو چکا ہو گا اور پھر جرمنی اور اعزاز کے درمیان چند انچ کا ہی فاصلہ رہ جائے گا۔

جرمنی فٹ بال ٹیم کی کامیابی کی شرح اور اس کی فٹ بال صلاحیت ایسی غضب کی ہے کہ کسی کے لیے اگر یہ ٹیم راحت جاں ہے تو کسی کو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی لیکن مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو میدان میں سب سے زیادہ حاضری جرمن ٹیم کی موجودگی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ اسے پسند اسی لیے کیا جاتا ہے کہ یہ حریف ٹیم کے کھلاڑیوں کو نچائے رکھتے ہیں اور اس سے نفرت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس ٹیم کے کھلاڑی انتہائی بددماغ اور خودپسند ہوتے ہیں۔ آج ہٹلر نہیں ہے لیکن یہ آج بھی خود کو دنیا کی عظیم ترین قوم سمجھتے ہیں اور جب فٹ بال، ہاکی یا ٹینس میں یہ کوئی اعزاز پالیتے ہیں تو ان کا سیدھا جواب یہ ہوتا ہے کہ "ہم تھے ہی اس کے مستحق" گویا باقی دنیا ان کی نظروں میں کچھ نہیں ہے وہ کبھی حریف ٹیم کے کھیل کی تعریف نہیں کرتے مگر ہارنے پر یہ کہتے ہیں کہ آج ہم پوری قوت سے نہیں کھیلے۔

بہرحال جرمنی کی واحد ٹیم ہے جو چار بار یوروپی چمپن شپ کے فائنل میں پہنچی ہے۔ دو مرتبہ ۱۹۷۲ اور ۱۹۸۰ میں مشرقی جرمنی کے انضمام سے قبل مغربی جرمنی کی حیثیت سے یوروپی چمپئن رہی اور دو بار ۱۹۷۶ اور ۱۹۹۲ میں رنرز اپ رہی۔ اور اب "یورو ۹۶" کے لیے وہ ایک مرتبہ پھر سٹہ بازار میں پہلے مقام پر کھڑی ہے اور اسے ہنری ڈلانسی ٹرافی کا مضبوط ترین دعویدار قرار دیا جا رہا ہے۔

اگر اس کو ورلڈ کپ کے آئینہ میں دیکھا جائے تو ۱۹۵۴، ۱۹۷۴ اور ۱۹۹۰ میں فاتح عالم رہا ہے اور ۱۹۶۶، ۱۹۸۲ اور ۱۹۸۶ میں رنرز اپ رہا۔ ۱۹۷۰ میں اس نے تیسری پوزیشن پائی تھی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ آخر جرمنی کی ان شاندار کامیابیوں کا راز کیا ہے؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جرمنی کی مسلسل کامیابیوں یا فٹ بال کی بہترین صلاحیت کا سبب اس کا بے مثال کوچنگ نظام ہے۔ جس میں ایک تسلسل ہے اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد جب سے فیفا کی دوبارہ رکنیت حاصل کی ہے اس وقت سے اب تک جرمنی نے صرف ۵ کوچ قومی ٹیم کو دیے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس دنیا کے تمام فٹ بال ممالک اس مدت میں بیسیوں کوچ بدل چکے ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے صرف انہیں ہی کوچ مقرر کیا ہے جو قومی فٹبال کی کریم رہ چکے ہیں۔

اگرچہ انگلش والے جرمنی سے شدید نفرت کرتے ہیں لیکن اس کا دیوقامت اسٹرائیکر جرگن کلنسمانی ان کی آنکھ کا تارا ہے۔ اس نے حال ہی میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ جرمنی فٹ بال مشین کیوں اتنا نکھرا ہوا کھیل پیش کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہماری کامیابی کے پس پشت سائنسی طرز فکر اور طرز عمل کار فرما ہے۔

> اس بار تو جرمن کھلاڑیوں نے اپنی صلاحیتوں کے باوجود خدا سے لو لگا رکھی ہے اور انہیں امید ہے کہ اللہ ان کی مدد کرے گا، اور وہ لفظ اللہ اس لیے استعمال کر رہے ہیں کیونکہ ٹیم کا ایک بہترین فارورڈ اسٹیفن کنز ترکی میں بیسکتاس استنبول کلب سے کھیلتا ہے وہ اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے تعویذ لایا ہے جنہیں "چشم اللہ" کا نام دیا گیا ہے اور اس تعویذ کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ مصیبتوں، آفات، بلاؤں، پریشانیوں اور ناکامیوں سے محفوظ رکھتا ہے

جرمن ٹیم میں سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس میں مساوات پر خاص طور پر عمل کیا جاتا ہے اور جو درس اسلام دیتا ہے اس پر مسلم ممالک تو عمل پیرا نہیں ہیں لیکن جرمن کھلاڑی اس پر عمل کرتے ہیں یہ بھی ان کی کامیابی کا اصل راز ہے۔

جرمن ٹیم میں تمام کھلاڑیوں کو برابری کا درجہ دیا جاتا ہے خواہ وہ کلنسمانی اور تھامس ہیلر جیسے شہرہ آفاق اور دنیا کے مہنگے ترین کھلاڑی ہوں یا میترا پیلس یا فریڈی بابی جیسے نئے اور معمولی درجے کے کھلاڑی ہوں۔ وہ سب کے سب ٹیم کے کوچ اور مینیجر کے تیار کردہ پروگرام پر عمل کرتے ہیں اور ان میں سینئر جونیئر کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ جبکہ اس کے برعکس اسلامی ملکوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کی ٹیموں کے سینئر کھلاڑی اپنے کوچ اور مینیجر اور متعلقہ فیڈریشن کو بلیک میل ہی نہیں کرتے بلکہ جونیئر کھلاڑیوں سے الگ تھلگ رہ کر خود کو ان سے برتر ثابت کرتے ہیں۔

یہی نہیں اس بار تو جرمن کھلاڑیوں نے اپنی صلاحیتوں کے باوجود خدا سے لو لگا رکھی ہے اور انہیں امید ہے کہ اللہ ان کی مدد کرے گا، اور وہ لفظ اللہ اس لیے استعمال کر رہے ہیں کیونکہ ٹیم کا ایک بہترین فارورڈ اسٹیفن کنز ترکی میں بیسکتاس استنبول کلب سے کھیلتا ہے وہ اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے تعویذ لایا ہے جنہیں "چشم اللہ" کا نام دیا گیا ہے اور اس تعویذ کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ مصیبتوں، آفات، بلاؤں، پریشانیوں اور ناکامیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ شیشہ کا بنا یہ تعویذ آنکھ کی

باقی: صفحہ ۶ پر

اس بار فرنچ اوپن ٹینس کھیل اور حسن کا دلآویز سنگم بن گیا

حال والے فرنچ اوپن میں جہاں تماشائیوں کو مدتوں بعد جارحانہ کھیل دیکھنے کو ملا وہیں حسن پرستوں کو خاتون کھلاڑیوں کے نوع بہ نوع ملبوسات نے بھی کافی متوجہ کیا۔ امسال موسم کافی سخت تھا جس کی وجہ سے مٹی سے بنے کورٹ میں کافی سختی تھی جس سے تیز سروس اور تیز اسٹروک لگانے والے کھلاڑیوں کو فائدہ ملا۔ مدتوں سے فرانس کا موسم اس ٹورنامنٹ کے موقع پر سرد ہوا کرتا اور وقتاً فوقتاً بارش بھی ہو جاتی جس سے کورٹ میں سختی باقی نہ رہتی۔ چنانچہ دیر تک ریلی کرنے کی صلاحیت رکھنے والے کھلاڑیوں کو اس سے خوب فائدہ پہنچتا تھا اور جارحانہ کھیل کے ماہر کھلاڑی اس ٹورنامنٹ میں کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل کر پاتے تھے۔ ہی میں ختم ہونے کھیل کے ساتھ اس بار کھلاڑیوں کے لباس بھی مرکز توجہ رہے۔ خاص طور سے فرانس ہی کی خوبصورت کھلاڑی میرس پیرس کا سیاہ ملبوس جو ساتر کم تھا اور بدن کی نمائش کی غرض سے پہنایا گیا تھا، تماشائیوں کو کافی پسند آیا۔ لیکن تماشائیوں کی پسند کا لباس پہن لینا اور بات ہے اور اچھا کھیل کھیلنا دوسری بات۔ چنانچہ پیرس کا لباس انہیں ٹورنامنٹ کے چوتھے راؤنڈ سے آگے نہ لے جاسکا۔ پھر بھی پیرس نے کہا کہ کم از کم ان کا لباس تماشائیوں کو پسند آیا۔ اگر پیرس اچھا کھیلتیں تو شاید وہ اور ان کا لباس دونوں اور زیادہ پسند کیے جاتے۔

> کھیل کے ساتھ اس بار کھلاڑیوں کے لباس بھی مرکز توجہ رہے۔ خاص طور سے فرانس ہی کی خوبصورت کھلاڑی میرس پیرس کا سیاہ ملبوس جو ساتر کم تھا اور بدن کی نمائش کی غرض سے پہنایا گیا تھا، تماشائیوں کو کافی پسند آیا۔ لیکن تماشائیوں کی پسند کا لباس پہن لینا اور بات ہے اور اچھا کھیل کھیلنا دوسری بات۔

اسٹیفی گراف، جو بالاخر ٹورنامنٹ کی فاتح ہوئیں، انہوں نے پیرس کے لباس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ اچھا تھا لیکن یہ ٹینس لباس نہیں لگتا تھا۔" چنانچہ گراف نے خود پورے ٹورنامنٹ میں وہی لباس زیب تن کیا جو ٹینس کی خاتون کھلاڑی بالعموم پہنتی ہیں۔ لیکن ایک فنکشن میں مس گراف نے، ہزار دو سو ڈالر کا ایک ملبوس پہن کر سبھی کو مبہوت کر دیا۔ خود ان کا کہنا تھا کہ اس لباس میں وہ کسی ملک کی ملکہ لگ رہی تھیں۔

گراف کسی ملک کی ملکہ تو نہیں ہیں لیکن فرنچ اوپن کی ملکہ ضرور بن گئیں۔ یہ خطاب انہوں نے پانچویں بار جیتا ہے۔ فائنل میں ایک سخت مقابلے میں انہوں نے تین سیٹوں میں اسپین کی اونیزا ماسنچز کو ہرایا۔ یہ فائنل فرنچ اوپن کی تاریخ کا، جہاں تک خاتون ٹینس کا تعلق ہے، سب سے طویل فائنل تھا۔ اس میں کل ۴۱ گیم کھیلے گئے اور میچ ۳ گھنٹہ چار منٹ تک جاری رہا۔

مرد کھلاڑیوں کے ملبوسات پر بھی اس بار لوگوں کی خاص توجہ رہی۔ امریکہ کے آندرے اگاسی بھی میری پیرس کی طرح ہی، طرح طرح کے لباسوں کے شوقین ہیں۔ ان کی شرٹ کچھ یوں کھلی رکھی گئی تھی جس سے یہ پتہ چلے کہ اب وہ اپنے سینے کے بالوں کی صفائی نہیں کراتے۔ اگاسی صرف لباس ہی کی حد تک کامیاب رہے۔ اور جہاں تک کھیل کا تعلق ہے تو وہ دوسرے ہی راؤنڈ میں شکست کھا کر گھر واپس ہو لیے۔ اگاسی کی بہ نسبت جرمنی کے مائیکل اسٹک کا لباس اور کھیل دونوں، لوگوں کی توجہ کا مرکز رہے۔ اسٹک بالاخر فائنل میں پہونچے جہاں انہیں روس کے کافل نیکوف نے ہرا دیا۔ ٹورنامنٹ کے لیے اسٹک پوری طرح تیار نہیں تھے۔ پھر بھی چونکہ کورٹ سخت تھا اس لیے ان کے جیسے اسٹروک اور تیز سروس کے ماہر کھلاڑی کو اس سے کافی فائدہ پہونچا۔

روس کے کافل نیکوف اس پورے ٹورنامنٹ میں بہت اچھا کھیلے۔ وہ بہت ہی محنتی کھلاڑی ہیں جس کا انہیں پھل بھی ملا۔ انہوں نے نہ صرف سنگل خطاب جیتا بلکہ مردوں کا ڈبل خطاب جیتنے والی ٹیم کا بھی ایک حصہ تھے۔ کافل نیکوف پورے ٹونامنٹ میں صرف ایک سیٹ ایک میچ میں نہ جیت سکے ورنہ اپنے ہر مقابل کو سیدھے سیٹوں میں ہرایا۔

نمبر ایک کھلاڑی پیٹ سمپراس سیمی فائنل

باقی: صفحہ ۶ پر

میرس پیرس نے اپنے کھیل سے زیادہ اپنے جاذب نظر لباس کی نمائش کی

"شادی کے بعد دفتر اور گھر کی ذمہ داری نے مجھے لڑکی سے دادی بنادیا"

ملازمت پیشہ خواتین دفتر میں باس کو اور گھر میں شوہر کو خوش رکھنے کی مشکلات میں کیسے جکڑی رہتی ہیں

ماں بننے کو دلچسپ تجربے سے تعبیر دینے والے شخص نے شاید ملازمت پیشہ عورتوں کی حالت کو یہ فیصلہ سناتے وقت پیش نظر نہیں رکھا۔ نئی نئی ماں بننے والی کسی بھی مہذب ملازمت پیشہ خاتون سے پوچھیے تو وہ یہی کہے گی کہ اس زندگی کو پرلطف تجربہ اسی وقت بنایا جاسکتا ہے جب چوبیس گھنٹوں کو کھینچ کر ۲۰، گھنٹے کردیا جائے۔ بات معقول ہی ہے اس لیے کہ بچے کو کھلانے پلانے، نہلانے دھلانے، گھر کے کام کاج نمٹانے، برتن اور کپڑے دھونے کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر ہے جس میں وہ الجھتی ہی رہتی ہے اور پھر دفتر اور فیکٹری بھی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس دوران گھر سے آنے والی تکلیف دہ ٹیلیفون کالیں بھی سننی ہیں کہ کسی نے قیمتی کٹ گلاس کا پیالہ توڑ دیا، کسی نے گھٹنا زخمی کرلیا تو کوئی من پسند کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ناراض ہوگیا ہے۔ شام کو گھر آئیے تو کوئی رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے ہے، اگر دو بچے ہیں تو دونوں اجارہ دارانہ حق جتاتے ہیں اور آپ کو نہیں چھوڑتے۔ ایک باہر جانے کی ضد کرتا ہے تو دوسرا گھوڑے کی سواری کرنے کے لیے مچل رہا ہے۔ اب باہر بھی آپ ہی کو لے جانا ہے اور گھوڑا بن کر سواری بھی آپ ہی کو کرانی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر شوہر بھی تو اس گھر کا یکساں طور پر ذمہ دار فرد ہے۔ وہ بھی ملازمت کرتا ہے اس لیے ملازمت پیشہ بیوی کی مشکلوں کا احساس کرکے وہ اس کا ہاتھ تو بٹاتا ہی ہوگا؟ یہ بات درست ہے کہ جہاں میاں بیوی دونوں کام کرنے والے ہوتے ہیں ان میں اس حد تک یگانگت ہوتی ہے کہ گھر داری کی ذمہ داریاں مل جل کر پوری کرلیں۔ مرد لوگ ہاتھ بٹاتے ہیں لیکن شام کو کام پر سے گھر آنے والا مرد بغیر ہاتھ منہ دھوئے سستی دور کیے اور چائے کے بغیر ہاتھ بٹانے پر آمادہ نہیں ہوپاتا۔ اس معاملے میں ایک نفسیاتی اصول کی طرف اشارہ کردینا برمحل ہوگا۔ عورت کے تمام مسائل سے واقف ہونے اور اس سے ہمدردی کے باوجود بیشتر مرد ایسی بیویوں کی خواہش رکھتے ہیں جو باہر ملازمت تو کریں لیکن گھر کے کام سے بھی جی نہ چرائیں، وہ کام پر سے لوٹے تو اس کا چہرہ کھلا ہوا ہو تاکہ اس کی شام خوشگوار گذرے۔

مختلف پیشوں سے وابستہ خواتین کے تجربات اس سلسلے میں کم و بیش یکساں ہیں۔

> میاں بیوی کے مل جل کر کام کرنے کی جو بھی کہانیاں انہوں نے سنی تھیں وہ سب بے حقیقت ثابت ہوئیں۔ دونوں رول بہت واضح ہیں۔ ایک صرف باہر کام کرتا ہے اور دوسرے کو باہر اور گھر میں دونوں جگہ کام کرنا ہے۔ مرد گھر آتا ہے آرام پانے کے لیے آپ اسے اور کام دینے لگیں تو وہ گھر بھی دیر سے آنے لگے گا

ایک کنسلٹنگ ایجنسی میں کام کرنے والی دو بچوں کی ماں سیما کھورانہ کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد آپڑنے والی ذمہ داریوں نے انہیں لڑکی سے دادی بنادیا اور میاں بیوی کے مل جل کر کام کرنے کی جو بھی کہانیاں انہوں نے سنی تھیں وہ سب بے حقیقت ثابت ہوئیں۔ دونوں رول بہت واضح ہیں۔ ایک صرف باہر کام کرتا ہے اور دوسرے کو باہر اور گھر میں دونوں جگہ کام کرنا ہے۔ مرد گھر آتا ہے آرام پانے کے لیے آپ اسے اور کام دینے لگیں تو وہ گھر بھی دیر سے آنے لگے گا۔

کمپنیوں اور دفتروں کے مالکان بھی شادی شدہ ملازمت پیشہ عورتوں کے مسائل کا کسی قدر احساس ضرور رکھتے ہیں ایسے ہی ایک ذمہ دار افسر کا کہنا ہے کہ اگر ایک شادی شدہ اور دوسری غیر شادی شدہ عورت کو ملازم رکھنے کے معاملے میں انتخاب کرنا ہو تو وہ ترجیح مؤخر الذکر کو دیں گے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ شادی شدہ عورت اپنے کام میں کاہلی برتے گی بلکہ اس کا ذہن دفتر کے زیادہ تر وقت میں اپنے بچوں اور گھر کے مسائل میں الجھا رہے گا۔ اور ٹیلی فون آنے جانے کا سلسلہ بھی ہر وقت لگا رہے گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ہر وقت کی مشقت سے اسے آرام کا موقع کم ہی نصیب ہوتا ہے اس لیے اس کو متعینہ وقت سے زیادہ دفتر میں روکا نہیں جاسکتا۔

ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں اکاؤنٹس افسر خاتون تو موجودہ صورت حال سے اس قدر عاجز ہیں کہ ان کے مطابق گذشتہ دو دہائیوں میں عورت کا رول ایسا بندھا ٹکا سا ہوگیا ہے کہ اگر وہ ملازمت کی راہ اختیار کرے تو سمجھیے کہ اس کا جنازہ ہی نکل گیا کیونکہ وہ باقی کچھ بھی کرے بیوی اور ماں کی حیثیت سے اپنے فرائض میں کسی طرح کوتاہی نہیں کرسکتی۔

یہی وہ مسائل ہیں جن کے پیش نظر اب پڑھی لکھی خواتین میں ۹ سے پانچ بجے تک کی ملازمت سے چپکے رہنے کا رجحان ہلکا پڑتا جارہا ہے اور وہ گھر پر رہ کر اپنی خانہ داری اور بچوں کی تربیت کو بہتر بنانے پر زیادہ توجہ صرف کررہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ کرنا آسان تو نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب خود کو لگی بندھی آمدنی سے محروم کرنا ہوگا۔ پہلی سی گرم جوشی اب نہیں رہ گئی ہے بلکہ دیکھا یہ گیا ہے شادی کے کچھ دن بعد تو خواتین کسی طرح ملازمت کرلیتی ہیں لیکن خاندان کی تشکیل کی جب ابتدا ہوجاتی ہے تو ان کے سامنے انتخاب بہت واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنا وقت دفتر کی نذر کریں یا اپنے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال میں۔

لگے ہاتھوں ازدواجی صورت حال پر بھی نظر ڈالتے چلیں جہاں ملازمت پیشہ بیوی اور خانہ دار شوہر پلاسٹک کے کھلونوں کا کاروبار کرتا ہے اور گھر ہی پر اس کا آفس ہے۔ بیوی باہر گھوم کر اسی کی مارکیٹنگ کرتی ہے۔ اس طرح شوہر بیوی کی غیر موجودگی میں بچوں کی دیکھ بھال کرلیتا اور ان کے لیے کھانا بھی تیار کرلیتا ہے۔ لیکن بچوں کو خواہ قریبی پارک میں ٹہلانے کا معاملہ ہو یا سوئمنگ پول کے پاس ان کی نگرانی یا پرامپ میں بٹھا کر ٹہلانے کا یہ سارے کام عورت کے ہی سمجھے جاتے رہے ہیں اور مرد بچوں کے ان معاملات سے بڑی ہی دور کا سروکار رکھنے والا سمجھا جاتا ہے خصوصاً بچوں کی کسی غلطی پر سرزنش کرنے کے لیے ہی اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ بچوں کی پرورش اور تربیت میں جب تک شوہر کے حکمراں ہونے کا تصور قائم رہے گا اور اس کی جگہ رفاقت، اشتراک عمل کا جذبہ نہیں لے لیتا مرد نونہالوں کے تئیں مسائل سے دور ہی رہے گا۔

ضرورت رشتہ

* سید سنی خاندان سے تعلق رکھنے والے دو بھائیوں (عمر بالترتیب ۲۹ - ۳۳ سال) کے لیے نجیب الطرفین سید خاندان / پٹھان خوبصورت لڑکیوں (عمر بالترتیب ۲۲ سال ۲۵ سال) سے رشتہ مطلوب ہے۔ ایک بھائی سعودی عربین ایرلائنس میں ایگزیکٹو اسسٹنٹ کے عہدہ پر فائز ہے جبکہ دوسرے بھائی کا اپنا کاروبار کناٹ پلیس میں ہے۔ ایرلائنس میں کام کرنے والے لڑکے کے لیے لڑکی میڈیکل لائن سے ہو اور دوسرے بھائی کے لیے ٹیچنگ یا بی فارما سے ہو تو ترجیح دی جائے گی۔ ایرلائنس میں کام کرنے اور بزنس کرنے والے دونوں بھائیوں کی تعلیم پوسٹ گریجویشن ہے۔ صرف مکمل بائیوڈیٹا روانہ کریں

محمد کٹی چیف بیورو

چندریکا ڈیلی۔ ۱۸ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی

فیکس ۳۳۲۲۹۹۲

* سنی مسلم لڑکا تعلیم انٹرمیڈیٹ (عمر ۳۴ سال، نیک صوم و صلوۃ کے پابند با اخلاق) کے لیے نیک دینی رجحان رکھنے والی صوم و صلوۃ کی پابند پڑھی لکھی لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ تفصیل بمعہ فوٹو بشرط واپسی روانہ کریں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۲۹۷

* ناسک میں مقیم تجارت پیشہ سنی خاندان کے بی کام لڑکے (عمر ۲۸ سال) کے لیے لمبے قد کی تعلیم یافتہ گھریلو لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۲۹۸

* سعودی عرب میں ملازم سنی خاندان کے انجینئر لڑکے (عمر ۲۸ سال، قد ۱۶۰ سینٹی میٹر) جس کی ماہانہ آمدنی پینتیس ہزار روپے ہے سعودی عرب میں رہنے پر راضی گریجویٹ اور بی ایڈ یا میڈیکل پروفیشن سے تعلق رکھنے والی خوبصورت لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۲۹۹

* سنی خاندان کے عمان میں لیکچرر لڑکے (عمر ۳۰ سال، قال ۱۷۰ سینٹی میٹر) کے لیے گریجویٹ لڑکی سے جلد رشتہ مطلوب ہے۔ خواہش مند حضرات ضروری تفصیل کے ساتھ فوٹو بھی روانہ فرمائیں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۰

* خلیج میں انجینئر کی حیثیت سے ملازم لڑکے (عمر ۲۷ سال، قد ۱۷۱ سینٹی میٹر) کے لیے خوبصورت ڈاکٹر یا دیگر پیشے سے وابستہ لڑکی سے رشتہ درکار ہے

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۱

* امریکی شہریت رکھنے والے خوبرو ۳۸ سالہ سنی بزنس مین کے لیے صحت مند چھریرے بدن کی گھریلو لڑکی سے جس کی عمر ۱۸ سے ۳۳ سال کے درمیان ہو رشتہ مطلوب ہے۔ تفصیل کے ساتھ رنگین تصویر بھی روانہ فرمائیں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۲

* سنی مسلم بزنس کنسلٹینٹ (عمر ۳۵ سال، قد ۵ فٹ گیارہ انچ) کے لیے باہر جانے کی خواہش مند ایم بی بی ایس لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۳

* بزنس پیشہ سنی خاندان کے مہذب گریجویٹ خوبرو لڑکے (عمر ۲۵ سال، قد ۱۷۱ سینٹی میٹر) کے لیے بمبئی میں مقیم مہذب تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۴

* سنی خاندان کے مذہبی رجحان والے لڑکے (عمر ۲۵ سال، قد ۱۶۵ سینٹی میٹر) کے لیے جس کا ذاتی مکان اور بزنس ہے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ تفصیل کے ساتھ بشرط واپسی فوٹو بھی روانہ کریں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۵

* ایک معروف کمپنی میں سات ہزار روپے ماہوار پانے والے اسسٹنٹ منیجر (عمر ۲۷ سال قد ۱۸۰ سینٹی میٹر) کے لیے موزوں رشتہ درکار ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۶

* یوپی میں مقیم سنی گریجویٹ سرکاری ملازم (تنخواہ ۳۵۰۰ روپے، عمر ۲۶ سال، قد ۱۶۸ سینٹی میٹر) کے لیے خوبصورت لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۷

* مہذب اور بارسوخ سنی خاندان کے دہلی میں پریکٹس کرنے والے ایم ڈی ڈاکٹر (عمر ۳۰ سال قد ۵ فٹ آٹھ انچ) کے لیے ڈاکٹر یا غیر ڈاکٹر خوبصورت لمبے قد کی لڑکی سے رشتہ درکار ہے۔ تصویر بھی ارسال فرمائیں۔

رابطہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل۔ باکس ۳۰۸

مفت بالکل مفت

Milli Times International
Classified Advertisements

اس کوپن کو کاٹ لیجیے چار کوپن ایک ساتھ بھیج کر آپ ضرورت رشتہ کا ایک اشتہار مفت چھپوا سکتے ہیں

"میرے باپ نے مجھ سے اپنے جنازے میں شامل ہونے کا حق چھین لیا تھا"

ایک اولاد سے محبت اور دوسری سے بے اعتنائی گھر کو تباہی کے راستے پر ڈال دیتی ہے

اسلامی اقدار میں عدل کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ صحت مند معاشرے کا استحکام اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلام انسانی اقدار کا تصور پیش کرتے ہوئے خاندان کو پورے معاشرے کے تناظر میں دیکھتا ہے کیونکہ افراد کے مختصر مجموعوں سے ہی امت بنتی ہے اور صالح بنیادوں پر ان کے درمیان تعامل معاشرے کی فلاح کا ضامن ہے۔ آپ کسی ایسے گھر یا خاندان کا تصور کیجیے جس کے افراد ایک دوسرے سے یگانگت اور تعاون کے بجائے عناد اور اختلاف کا رویہ اختیار کرتے ہوں تو ان میں سے کسی کی ترقی و بہبود کی ضمانت نہیں دی جاسکتی اور اسی لیے اسلام نے خاندان کے افراد کی عمر اور ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کی ذمہ داریوں کی نوعیت کا تعین بھی کیا ہے۔

ایک طرف انسان کے ضمیر پر اس کا نفس ہمیشہ غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف دین اسلام کی وہ تعلیمات ہیں جو اسے اپنے نفس کے احتساب پر اکساتی ہیں۔ احتساب کا یہی عمل جتنا شدید ہوتا جاتا ہے اسی قدر نفس کی سرکشی بھی بتدریج زائل ہوتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہر باپ اپنے سب سے بڑے یا چھوٹے بیٹے یا بیٹی سے ان کی کسی صلاحیت یا معصومیت کی بنا پر نسبتاً زیادہ شفقت کرتا ہے یہ ایک فطری امر ہے کیونکہ چھوٹے اور معصوم بچے نہ صرف والدین بلکہ دوسروں کی توجہ اور محبت کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑے کی بھی کسی خاص وصف کے لیے وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ لیکن وہی باپ اگر ایک پر تو جان چھڑکتا ہو اور دوسرے پر شفقت کی نگاہ ڈالنے کا بھی روادار نہ ہو اور گھر میں یہی عام رویہ اختیار کرلے تو بظاہر تو یہ ایک کے مقابلے میں دوسرے کو بجا ترجیح دینا ہی کہا جائے گا لیکن باپ کے اس عمل کے باطن میں جھانکیے تو اندازہ ہو گا کہ اس گھر کی دیوار کی اینٹیں ہلنا شروع ہو گئی ہیں۔ کیا شفقت و عنایت سے محروم بیٹا جس کے دل میں گرہ پڑ چکی ہے عمر کے آئندہ مراحل میں اس گھر کے افراد سے انسیت و یگانگت کا معاملہ کرے گا۔ ایسا شاید ہی ہو۔ یہ صورت حال

> باپ اگر ایک پر تو جان چھڑکتا ہو اور دوسرے پر شفقت کی نگاہ ڈالنے کا بھی روادار نہ ہو اور گھر میں یہی عام رویہ اختیار کرلے تو بظاہر تو یہ ایک کے مقابلے میں دوسرے کو بجا ترجیح دینا ہی کہا جائے گا لیکن باپ کے اس عمل کے باطن میں جھانکے تو اندازہ ہو گا کے اس گھر کی دیوار کی اینٹیں ہلنا شروع ہو گئی ہیں۔

کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہو جاتی ہے جب یہ دونوں بیٹے دو بیویوں سے ہوں۔ کچھ ایسی ہی حالت ایک صاحب کو در پیش آئی تھی جو صاحب حیثیت تھے اور جن کا بڑا کاروبار تھا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو انہوں نے بڑے ناز و نعم سے پالا اور ضروری تعلیم بھی دلائی جب وہ دونوں ذمہ داری کی عمر کی سرحد میں داخل ہوئے تو اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق بڑے بیٹے نے باپ کی تجارت میں ہاتھ بٹانا شروع کیا اور چھوٹے بیٹے نے الگ سے اپنی ایک دوکان کھول لی۔ چھوٹا بیٹا پابند صوم و صلوٰۃ اور دین داری کی طرف مائل تھا دوکان سے جو وقت بھی بچ رہتا وہ ذکر الٰہی میں گذارتا اور اس نے ماں باپ سے ملاقات کے لیے ہفتے دو ہفتے کا معمول مقرر کرلیا۔ رفتہ رفتہ ایک بیٹا والدین سے حد درجہ قریب اور دوسرا ان سے کافی دور ہو گیا۔ اس دوران باپ نے بڑے بیٹے اور اس کی ماں سے بہت زیادہ خوش ہو کر سارا کاروبار اور اثاثہ بڑے بیٹے کے نام کردیا۔ ان کی نظر میں ناکارہ بیٹا جس کا کاروبار بازاری مسابقت کی بنا پر ہلکا پڑ گیا تھا اور جسے اپنے بیوی بچوں کی اخراجات پورے کرنے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ والدین کے پاس آیا تو ان کی ماں نے باپ کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے پورا معاملہ اسے بتادیا جس کی رو سے باپ کی جائداد اور کاروبار میں سے اس کے ہاتھ کچھ نہیں لگنا تھا۔ دوکان سے اس کی آمدنی پہلے ہی بہت قلیل رہ گئی تھی باپ صاحب فراش ہو چکے تھے بھائی سے کچھ امید بندھی کہ شاید وہ کچھ ترس کھائے۔ لہٰذا اس کے پاس جاکر منت سماجت کی کہ باپ نے تو ناراضگی کے باعث مجھے کچھ نہ دیا اب تم میرے حال پر رحم کھاؤ۔ بڑا بھائی جو باپ کی شہ پاکر اب تک کافی شقی القلب اور چالاک ہو گیا تھا اس نے کہا کہ تم اطمینان رکھو جو کاروبار میرے ہاتھ میں ہے وقت آنے پر میں منافع میں سے تمہیں مناسب حصہ دوں گا۔ لیکن یہ ایسا وعدہ تھا جو کبھی وفا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ جب باپ کا انتقال ہو گیا اور چھوٹے بھائی نے بڑے کو اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ بالکل اپنے عہد سے منکر ہو گیا بلکہ اس کی تاویل اس طرح کی کہ اگر اپنے والد کی مرضی کے بغیر تمہیں کاروبار میں سے کچھ دیا تو ان کی روح کو شدید اذیت پہنچے گی۔

آخر یہ حرماں نصیب راضی برضا ہو کر بیٹھ رہا۔ باپ کے انتقال پر ان کے جنازے میں جو لوگ شریک تھے، دفعتاً ان میں بعض افراد کو یہ خیال ہوا کہ ان کی تدفین میں چھوٹا بیٹا شریک نہیں تھا۔ از راہ اخلاق چند افراد اس معمولی دوکاندار کے پاس گئے اور رسمی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اس کے باپ کے انتقال پر تعزیت کی تو اس نے بڑے غمناک لہجے میں صرف اتنا جواب دیا کہ انہوں نے مجھ سے یہ حق چھین لیا تھا کہ میں انہیں اپنا باپ کہوں تو پھر میں کس کے جنازے میں جاتا۔ پھر اس نے پورا معاملہ بیان کیا جو باپ اور بڑے بھائی نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ بہر حال اپنے ایمان کی قوت کے سہارے اس نے زندگی میں جدو جہد جاری رکھی۔ اس کے دن پھر پلٹے اس نے اپنی زندگی سے جو سبق سیکھا تھا اس کی روشنی میں اپنی اولاد کی اچھی تربیت کی انہیں بہتر تعلیم سے آراستہ کیا اور ایک ایماندار اور متقی انسان کی حیثیت سے زندگی گذاری۔

> جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ عدل کے اصول سے ذرا سی لغزش پورے ڈھانچے میں خرابی پیدا کر دیتی ہے اور ایسا وہیں ہوتا ہے جب خاندان کا ایک فرد اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کر جاتا ہے یا اپنی ذمہ داریوں کی نوعیت کو سمجھنے میں کہیں غلطی کر بیٹھتا ہے

معاشرے پر نظر ڈالیے تو ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ملے گی اور جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ عدل کے اصول سے ذرا سی لغزش پورے ڈھانچے میں خرابی پیدا کر دیتی ہے اور ایسا وہیں ہوتا ہے جب خاندان کا ایک فرد اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کر جاتا ہے یا اپنی ذمہ داریوں کی نوعیت کو سمجھنے میں کہیں غلطی کر بیٹھتا ہے۔

موسیقی کے سوال پر علماء میں اختلاف رائے ہے

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال:— موسیقی سننے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف کی کیا حقیقت ہے۔ بعض کے نزدیک یہ جائز ہے اور بعض اس سے اختلاف کرتے ہیں مثلاً چشتیہ سلسلے میں قوالی اور سماع کا رواج ہے جب کہ دوسروں کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

جواب:— موسیقی کے سوال پر علماء واضح طور پر دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ موسیقی سننے میں کوئی مضائقہ نہیں اور دوسرا اسے ممنوع قرار دیتا ہے۔ موسیقی کے جواز کے بارے میں عموماً یہ بات کہی جاتی ہے کہ ایسی موسیقی کا سننا جائز ہے جس کا سننے والے کے قلب و ذہن پر اچھا اور فرحت بخش اثر پڑے۔ جس موسیقی کے سبب کر جذبات اس طرح بھڑک اٹھیں کہ اس کے نتیجے میں ناپسندیدہ اور مکروہ و ممنوع حرکات سننے والے سے سرزد ہونے لگیں تو اس کا سننا جائز نہیں ہو گا۔ ایسی حالت میں سماعت موسیقی کے نتیجے سے اس بات کا تعین ہو گا کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ غرض کہ وہ موسیقی جسے سن کر وجد آئے اور ذہن و دل میں پراگندگی کے بجائے فرحت کا احساس پیدا ہو اس کے سننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔

سوال:— ایک مسجد میں تعمیر نو کی ضرورت تھی۔ جب وہ گرائی گئی تو اس میں سے بہت سی لکڑی اور دیگر سامان ایسا نکلا جو نئی تعمیر میں استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ بیچے جانے کی صورت میں کچھ رقم ان سے ضرور حاصل ہو جاتی۔ اب اس سامان کو کس مصرف میں لیا جائے براہ کرم مشورہ دیں۔

جواب:— جب مسجد کو از سر نو تعمیر کرنے کی غرض سے گرایا گیا ہے تو پرانی عمارت کی ہر وہ چیز جو بیچی جاسکتی ہو اور دوبارہ استعمال میں نہ آسکتی ہو اسے فروخت کر دیا جائے اور جو رقم ملے وہ تعمیر نو کے حساب میں ڈال دی جائے۔ بعض لوگوں کو فکر رہتی ہے کہ کوئی بھی چیز جو مسجد کی ملکیت ہو اسے مسجد کے اندر ہی استعمال ہونا چاہیے یعنی کہ وہاں سے اگر کوئی دروازہ نکالا گیا ہے تو وہ کسی اور مسجد میں لگ جانا چاہیے یا یہ کہ جو نئی مسجد بن رہی ہے اس میں وہ دروازہ لگا دیا جائے۔ یہ بات ممکن تو ہے لیکن اس میں عملی دشواریاں خاصی ہیں ایسی صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ جو اشیاء ناقابل استعمال ہیں ان کی معقول قیمت مقرر کرلی جائے اور حاصل ہونے والی رقم نئی مسجد کی تعمیر کے اخراجات میں شامل کرلی جائے۔ اگر مسجد کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے تو اس رقم کو سنبھال کر رکھا جائے کیونکہ یہ آئندہ مرمت اور صفائی ستھرائی پر آنے والے اخراجات کو پورا کرنے میں کام آسکتی ہے۔

> جب آپ کسی سے قرض لیتے ہیں تو وہ آپ کے ساتھ بڑا احسان کرتا ہے لہٰذا قرض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اس شخص کی بھلائی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔

سوال:— میں سعودی عرب میں ملازم ہوں اور وطن میں میں نے ایک بڑی رقم کسی سے قرض لی ہے جہاں میری املاک قرض لی گئی رقم سے خاصی زیادہ ہے۔ تاہم اگر مجھے یہ قرض اپنی تنخواہ سے چکانا ہو تو کم و بیش دو سال کا عرصہ لگے گا۔ کیا بغیر قرض کی ادائیگی کے مجھے حج کرنے کی اجازت ہے؟

جواب:— اگر کوئی شخص مقروض ہے تو حج اس پر واجب نہیں۔ چونکہ وہ مالی استطاعت کی شرط پوری نہیں کررہا ہے۔ اس معاملے کے دو الگ الگ پہلو ہیں۔

خاص طور پر آپ کے معاملے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ حج کرسکتے ہیں کیونکہ اگر ضرورت پڑ جائے تو اتنی املاک آپ کے پاس ہے کہ قرض ادا ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ کہ آپ سعودی عرب میں مقیم ہیں اس لیے گھر واپس آنے کے بعد حج کرنے کے اخراجات کے مقابلے میں اس وقت خرچ کم ہو گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اس موقع پر حج کی سعادت حاصل کرلیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنا قرض ادا کرنے کی بھی بھرپور سعی کرتے رہیں۔ اسلام اسی جذبے کو فروغ دیتا رہا ہے کیونکہ جب آپ کسی سے قرض لیتے ہیں تو وہ آپ کے ساتھ بڑا احسان کرتا ہے لہٰذا قرض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اس شخص کی بھلائی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔ تشکر کا یہ جذبہ آپ کو جلد از جلد قرض سے سبک دوش ہونے کی ترغیب بھی دے گا۔

آپ کے دانت بیمار ہیں؟ علاج کیجئے ورنہ ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے

دانتوں کی صفائی کے لئے سیب سے بہتر کوئی پھل اور غذا نہیں

آج کل آئے دن کی آپا دھاپی اور تفکرات سے بھری ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کھانا بھی ایک کام سمجھ کر کھاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حد درجہ مصروفیت میں گھرے ہوئے لوگ چند منٹ نکال کر جلدی جلدی چند لقمے گلے سے نیچے اتار کر ہاتھ میں موجود کام میں پھر منہمک ہوجاتے ہیں۔ اس کے دوسرے نقصان عموماً سامنے آتے ہیں لیکن لوگ ہیں کہ اس طرف توجہ دینے کا وقت کم ہی نکال پاتے ہیں۔ پہلا نقصان تو یہی ہے کہ اس سے سوء ہضم کا عارضہ پیدا ہوجاتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس طرح دانتوں اور جبڑوں کی جو ضروری ورزش کھانے کے دوران ہوتی ہے وہ ہو نہیں پاتی جس کے نتیجے میں مسوڑھے اور جبڑے کمزور ہوجاتے ہیں جن کا کام دانتوں کو مضبوط گرفت میں رکھنا ہوتا ہے۔ لقمے کو اچھی طرح چبا کر کھانے پر اطبا کے یہاں اسی بنا پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ یہ عمل بذات خود منہ کے اندر مختلف حصوں کی صفائی کا کام بھی کرتا رہتا ہے۔ جب ایسی غذا کا سلسلہ ہی ختم ہوجائے گا جسے چبا کر کھایا جائے تو ظاہر ہے کہ صفائی کا یہ قدرتی عمل بھی اپنے آپ رک جائے گا اور دانت کمزور ہوجائیں گے۔ دانتوں کی کمزوری سے نہ صرف دانتوں میں تلوث اور خلا جیسی شکایات کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ تازہ ترین تحقیق جو برٹش میڈیکل جرنل میں شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دانتوں اور مسوڑھوں کے عارضے میں مبتلا ہونے والے افراد کو ہارٹ اٹیک کا خطرہ ان لوگوں سے زیادہ رہتا ہے جو ان عوارض سے بچے رہتے ہیں۔ محققین کی اس نتیجے تک رسائی کی بنیاد یہ ہے کہ دندانی تلوث سے پیدا شدہ زہریلے مادے دوران خون میں شامل ہوکر خون کی شریانوں کے اوپر کولسٹرول کی پرت چڑھائے رہتے ہیں اور ان میں تنگی آتی جاتی ہے۔

غذا میں ہمیں پھل خصوصاً امرود، گنا اور سیب کھانے کا خاص اہتمام کرنا چاہئے اور ساتھ میں سلاد اور سبزیاں بھی کیونکہ ان چیزوں کے ذریعے صفائی اور ورزش کا قدرتی عمل بھی انجام پاتا ہے۔ لیکن ادھر یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ لوگ ابلے ہوئے انڈوں، چپک دار پروسسڑ غذائیں، ڈبل روٹی، چاکلیٹ، مٹھائیاں اور آئس کریم کا استعمال زیادہ کر رہے ہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ منہ میں رکھیے اور گلے کے نیچے اتر جائیں گی۔ دانت کے عمل سے ان کا کوئی سروکار ہے ہی نہیں۔ یہ تمام اشیاء خمیر آور کاربوہائیڈریٹس کو مختلف ارگینک ایسڈس میں تبدیل کرتی ہیں اور یہی ایسڈس دانتوں کی قدرتی پالش پر حملہ آور ہو ہو کر ان میں خلا اور درزیں پیدا کردیتی ہیں اور داڑھوں میں خاص طور پر اتنے گڈھے ہوجاتے ہیں کہ ان میں غذا کے ذرات اٹک جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور خلا بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ دانت گرنے لگتے ہیں۔

چینی ملے ہوئے سوڈا کا اثر دانتوں پر بڑی تیزی سے ہوتا ہے۔ چند برس پہلے کیے گئے ایک تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ کسی معروف کولا کی مہر بند بوتل میں رکھا ہوا انسانی دانت تین ماہ کے عرصہ میں پوری طرح تحلیل ہوگیا۔ دانتوں کی حفاظت کے معاملہ میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ دانتوں کی پالش ہی پورے جسم کا وہ خلیہ ہے جو خود بخود مندمل نہیں ہوتا۔ اگر یہ ضائع ہوگیا تو سمجھئے کہ آپ کے جسم کا ایک مستقل حصہ الگ ہوگیا۔ علاج بیماری سے بہتر ہے کا مقولہ اگر سب سے زیادہ صادق آتا ہے تو دانتوں کی صحت کے شعبے پر

دانتوں کو مضبوط رکھنے کے بعض قدرتی طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ گھر میں اگائے ہوئے گیہوں کے پودے کی ہری ڈنٹھل اتنی دیر تک چبائیں کہ اس کے ریشے میں سفیدی جھلکنے لگے۔ اس ڈنٹھل میں موجود فعال کلوروفل دانتوں کو گرنے اور سڑنے سے بچاتا ہے۔ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جو دانتوں اور منہ کو صاف کرنے میں مددگار ہوتی ہیں تو سیب سے بہتر اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اپنی کتاب "ڈنٹل سروے" میں ڈاکٹر ڈونالڈ ٹی ہانکس نے لکھا ہے کہ کھانے کے بعد اگر کوئی ایک سیب کھالے تو اس کا وہی کام ہوتا ہے جو ٹوتھ برش کا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ دانت صاف ہوتے ہیں بلکہ لعاب دہن کی روانی میں بہتری بھی آتی ہے اور یہ مادہ بھی دانتوں کی صحت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دانتوں کو چمکانے کا قدرتی طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ برش کرنے سے پہلے اسے لیموں کے عرق میں بھگولیں۔ دانتوں کی صفائی اور ورزش کرنے والی غذاؤں کی طرف خصوصی توجہ دے کر ہم دانتوں کو لاحق ہونے والے عارضوں سے محفوظ رہ سکتے اور مصنوعی سہاروں سے بھی بچ سکتے ہیں۔

> چینی ملے ہوئے سوڈا کا اثر دانتوں پر بڑی تیزی سے ہوتا ہے۔ چند برس پہلے کیے گئے ایک تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ کسی معروف کولا کی مہر بند بوتل میں رکھا ہوا انسانی دانت تین ماہ کے عرصہ میں پوری طرح تحلیل ہوگیا۔ دانتوں کو مضبوط رکھنے کے بعض قدرتی طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ گھر میں اگائے ہوئے گیہوں کے پودے کی ہری ڈنٹھل اتنی دیر تک چبائیں کہ اس کے ریشے میں سفیدی جھلکنے لگے۔ اس ڈنٹھل میں موجود فعال کلوروفل دانتوں کو گرنے اور سڑنے سے بچاتا ہے۔

دواؤں کا جسمانی آہنگ سے گہرا رشتہ ہوتا ہے

دوائیں اس کا بھی اثر قبول کرتی ہیں کہ کتنی دیر سوتے ہیں کتنا مستعد اور کتنا سست رہتے ہیں

آپ نے سوچا ہے کہ مریضوں کو زیادہ تر دوائیں سوتے وقت کیوں دی جاتی ہیں، کیونکہ دن اور رات کا جسمانی نظام سے گہرا تعلق ہے کولون کینسر میں مبتلا ایک ساٹھ سالہ مریض کو کچھ دن سے اچانک کیموتھراپی کا سلسلہ بند کرنا پڑا جب اس کے مضر اثرات بڑھ گئے۔ لیکن اب وہی مریض اب اس حالت میں آگیا ہے کہ بغیر کوئی منفی رد عمل ظاہر کیے وہ تمام دوائیں استعمال کرسکتا ہے جو پہلے اسے نقصان کر رہی تھیں۔ اس تبدیلی کا سہرا ہرمین سنٹر فار کرونو بایولوجی اور کرونو تھراپٹکس کے ڈاکٹر لوئی کمپوس کو جاتا ہے جنہوں نے مریض کے جسم کے داخلی آہنگ کی نزاکتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کرونا تھراپیٹکس کا ایک نظام الاوقات وضع ہوجانے سے طبی مسائل کی تشخیص میں بھی بڑی آسانیاں پیدا ہونے والی ہیں اور طب کے پیشے میں یہ طریقہ کار واقعی ایک دن انقلاب لائے گا۔ دمہ، گٹھیا اور السر کے علاج میں کرونو تھراپیٹکس کا طریقہ کار ترقی یافتہ ممالک میں پہلے ہی رائج ہے۔ دمہ میں استعمال ہونے والا ایک نیا نسخہ جو مریض کو وقفے وقفے سے دن میں دیا جاتا تھا اب وہی رات میں دیا جانے لگا ہے اور اسی طرح بہتر نتائج کے لیے سوء ہضم رفع کرنے والی دوائیں بھی رات کو ہی استعمال کرائی جاتی ہیں۔ گٹھیا کی صبح کو اور السر کی دوائیں شام کو دی جاتی ہیں کیونکہ معدے سے خارج ہونے والے تیزابی مادے ان اوقات میں اپنے عروج پر ہوتے ہیں اور دوائیں تیزابیت کو مارتی ہیں۔

بریسٹ کینسر کے معاملات میں سرجری کو ہارمونی ادویات کے مطابق تقسیم سے حیات و موت کا فرق واقع ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر جسمانی افعال جسم کے روزانہ، ہفتہ وار، ماہوار یا سالانہ بایولوجیکل تبدیلیوں سے مربوط ہوتے ہیں اور اسی سے اس بات کا بھی تعین ہوتا ہے کہ کوئی شخص کب اور کتنی دیر سوتا ہے۔ کتنا مستعد یا کتنا سست ہے اس جسمانی آہنگ کو برقرار رکھنے کا مرکز دماغ کا وہ حصہ ہے جسے Hypothalamus کہتے ہیں۔ رشونی اور تاریکی کی بدلتی ہوئی حالتوں سے جسم کا یہ آہنگ اثر قبول کرتا ہے اور اس کے مطابق خود کو ڈھالتا ہے۔ روشنی اور تاریکی کے اعتبار سے ہی جسم کے غدود سے ہارمونوں کا اخراج ہوتا ہے، جو آہنگ کو برقرار رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ ہارمون سے ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جس سے نیند آئے اور اس سے جسم کے درجہ حرارت اور کارشیول یا اسٹرس ہارمون کی سطح میں بھی کمی آتی ہے۔ صبح کی روشنی Melemtonin کو دبا کر جسم کا درجہ حرارت بڑھا دیتی ہے۔ ہارمون لیول میں کمی و زیادتی کے علاوہ داخلی جسمانی آہنگ کئی دیگر عوامل کو بھی کنٹرول کرتا ہے جن کا تعلق دماغ کی برقی سرگرمی سے لے کر ایام حیض تک سے ہے۔ جسم کے کئی دیگر افعال کا تعلق بھی سونے اور جاگنے سے ہے۔ گویا کہ بلڈ پریشر، درجہ حرارت، نبض کی رفتار اور جیابولزم میں اتار چڑھاؤ ہمیں اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ بیماریوں سے دفاع کے لیے ہم کس وقت پوری طرح آراستہ ہیں اور کب ان کے مقابلے میں کمزور پڑ رہے ہیں سونے اور جاگنے کے معمول کو بہتر بنانے کے لیے غذائی عادتوں میں بہتری لانے کی ضرورت تو رہتی ہے اس کے ساتھ ساتھ جسم کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے مناسب ورزش کی بھی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ کاربوہائیڈریٹ سے بھرپور غذا سیروٹونن نام کا مادہ جسم میں پیدا کرتی ہے جس سے دماغ پر غنودگی طاری ہوتی ہے اس کے برعکس پروٹین والی غذا سے ایسے مادے پیدا ہوتے ہیں جو اسے چست رکھیں۔

> کرونا تھراپیٹکس ایک نظام الاوقات وضع ہوجانے سے طبی مسائل کی تشخیص میں بھی بڑی آسانیاں پیدا ہونے والی ہیں اور طب کے پیشے میں یہ طریقہ کار واقعی ایک دن انقلاب لائے گا۔ دمہ، گٹھیا اور السر کے علاج میں کرونو تھراپیٹکس کا طریقہ کار ترقی یافتہ ممالک میں پہلے ہی رائج ہے۔

> بہتر نتائج کے لئے سوء ہضم رفع کرنے والی دوائیں بھی رات کو ہی استعمال کرائی جاتی ہیں۔ گٹھیا کی صبح کو اور السر کی دوائیں شام کو دی جاتی ہیں۔ کیونکہ معدے سے خارج ہونے والے تیزابی مادے ان اوقات میں اپنے عروج پر ہوتے ہیں اور دوائیں تیزابیت کو مارتی ہیں۔

کیا کمیونزم کے زوال کے بعد اسلام اور مغرب ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے ہیں

ایک مغربی مصنف نے مشرق و مغرب کے ذہنوں پر چھائے اندیشوں کے بادل صاف کرنے کی کوشش کی ہے

ملی ٹائمز میں تبصرے کے لئے دو نسخے آنا لازمی ہیں تبصرے کے لئے کتابوں کے انتخاب کا حتمی فیصلہ ادارہ کرے گا البتہ وصول ہونے والی کتابوں کا اندراج ان کالموں میں ضرور ہو گا۔

نام کتاب: Islam And The Myth Of Confrontation

مصنف: فریڈ ہیلی ڈے

قیمت: 12.95 ڈالر، صفحات: ۲۵۶

مبصر: شوسا گپی / ترجمہ: س۔ احمد

دوسری جنگ عظیم کے زمانے ہی سے مشرق وسطیٰ پے در پے تصادم کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ کئی دہائیوں تک سرد جنگ کے تماشے بھی دیکھے جاتے رہے جب روس امریکی غلبے کو ختم کر کے تیل کی دولت سے مالامال خطے میں اپنا رسوخ قائم کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ یہ عام خیال بن چکا تھا کہ اگر تیسری جنگ عظیم بھڑکی تو خلیج فارس کے کنارے ہی لڑی جائے گی۔ تاہم اگرچہ اس سرد جنگ کے حریف علاقائی گٹھ جوڑوں کی بدولت بدلتے رہے بنیادی طرز عمل اپنی جگہ پر قائم رہا اس کی وجہ تھی شاہ کے دور حکومت کا ایران، جو اس خطے میں اس کی بہترین اور مسلح ترین فوجی طاقت، امریکہ نواز رویہ اور اسرائیل کے تئیں غیر جانب دارانہ پالیسی۔ گویا ایران مشرق وسطیٰ میں جس پر عربوں کی بالادستی تھی ایک طرح کا توازن کا ضامن تھا۔ ۱۹۷۹ کے انقلاب کے بعد یہ توازن ٹوٹ گیا اور سیاسی رزمگاہ میں جس رجحان نے قدم رکھا وہ تھا اسلامی بنیاد پرستی کا۔

ایسے افراد کم ہی ملیں گے جو مشرق وسطیٰ کی سیاسی پیچیدگیوں کے مطالعے میں فریڈ ہیلی ڈے جیسے فہم و بصیرت کا ثبوت دے سکیں۔ فارسی اور عربی میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مشرق وسطیٰ کے معاشروں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور مخصوص ممالک کے مسائل پر ان کی کئی تصانیف بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب عالمی روابط کے وسیع تناظر میں عہد حاضر کے مشرق وسطیٰ کا ایک تفصیلی تجزیہ ہے۔

صدام حسین کے حقوق انسانی کی پامالی کے تمام گذشتہ ریکارڈ کو نظر انداز کرتے ہوئے مغرب نے عراق کو پوری طرح مسلح کیا اور ایران کے خلاف جنگ میں اس کی حمایت کی لیکن وہی مغرب کویت پر حملہ آور ہونے سے روک نہیں سکا۔ یہی وہ دوہرا معیار ہے جس کے لئے مصنف نے مغرب کی سرزنش کی ہے

کمیونزم کے زوال اور اور اسلامی بنیاد پرستی کے منظر عام پر آنے کے بعد سے اسلام کو مغرب کا جانی دشمن سمجھا جانے لگا ہے۔ مسلم بنیاد پرستوں کے مغرب مخالف نعرے اور اس خطے کو درپیش مختلف مسائل خواہ وہ خلیجی جنگ یا عرب۔ اسرائیل تصادم، سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات کا معاملہ ہو یا انسانی حقوق کی پامالی کا۔ ان سب کو مسلم معاشروں پر اسلام کے اثرات کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ غرض کہ اسلام کا جمہوریت اور سیکولرازم سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور اس کا کام اگر کچھ ہے تو تشدد اور جمود کا فروغ ہے۔

اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کے مفروضے کے حوالے سے بھی مصنف نے دونوں فریقوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے یعنی مغرب میں ان لوگوں کو جو کمیونزم کی جگہ اسلام کو اس کا دشمن ثابت کرنا چاہتے ہیں اور مشرق وسطیٰ میں ان بنیاد پرست حلقوں کو جو اس تصادم کی وکالت کرتے ہیں

پروفیسر ہیلی ڈے نے مشرق و مغرب دونوں طرف کے ذہنوں پر سے اندیشوں اور تعصبات کی دھند چھاٹنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے ابتدا میں "اسلام اور "اسلام" کے درمیان انہوں نے خط فاصل کھینچی ہے۔ اول الذکر سے ان کی مراد ہے ایک ایسا الہامی مذہب جس پر دنیا کے ایک ملین سے زائد مسلمان عمل پیرا ہیں اور دوسرے کا مفہوم ان کے نزدیک ایک ایسا سماجی اور سیاسی نظام ہے جس میں مختلف رنگ و نسل کے آمریت پرست اور عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے والے عناصر تصرفات کرتے رہتے ہیں۔ موصوف نے اسلام کے اسی دوسرے رخ کو اپنی تصنیف کا خاص طور سے موضوع بنایا ہے۔

پہلا خام تصور جس کی انہوں نے تردید کی ہے یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ ایک مربوط وحدت ہے اور اس اعتبار سے باقی دنیا سے یکسر مختلف ہے اور ایسی نادر مثال ہے جو خارجی دنیا کی سمجھ سے باہر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مشرق وسطیٰ تہذیب کے مختلف ارتقائی مراحل میں مختلف تہذیبوں پر مشتمل رہا ہے اور ہے اور اسے وہ تمام مسائل درپیش ہیں جو تیسری دنیا کے دیگر ممالک کو ہیں۔ بدعنوانی، ظلم و جبر اور بربادی سب کچھ وہاں موجود ہے۔ اور نہ ہی اسلام ایک مرکزی نظام کی حیثیت سے تمام اسلامی ممالک میں نافذ ہے۔

اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کے مفروضے کے حوالے سے بھی مصنف نے دونوں فریقوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے یعنی مغرب میں ان لوگوں کو جو کمیونزم کی جگہ اسلام کو اس کا دشمن ثابت کرنا چاہتے ہیں (جس کا مقصد خاص طور پر ترقی یافتہ ممالک میں اسلحہ کی طاقتور صنعت کے مفادات کا تحفظ ہے) اور مشرق وسطیٰ میں ان بنیاد پرست حلقوں کو جو اس تصادم کی وکالت کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر کو شاید یاد نہیں کہ خود ان کی اصطلاحات ہی مغربی سیاسی محاورے سے مستعار ہیں۔ ایک طرف تو علامہ خمینی نے ٹیلی فون کو مغربی ایجاد قرار دے کر اس کے استعمال سے انکار کر دیا تھا اور دوسری طرف وہ مغربی طیارے ہی کے ذریعے ایران واپس آئے تھے۔ پروفیسر ہیلی ڈے نے خلیجی جنگ کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس سے زیادہ معلومات افزا اور تکلیف دہ تفصیل نظر سے نہیں گذری۔ صدام حسین کے حقوق انسانی کی پامالی کے تمام گذشتہ ریکارڈ کو نظر انداز کرتے ہوئے مغرب نے عراق کو پوری طرح مسلح کیا اور ایران کے خلاف جنگ میں اس کی حمایت کی لیکن وہی مغرب کویت پر حملہ آور ہونے سے اسے روک نہیں سکا۔ یہی وہ دوہرا معیار ہے جس کے لیے مصنف نے مغرب کی سرزنش کی ہے۔

آپ کی الجھنیں

آپ ٹیلیفون پر اپنی ساس کے بجائے اپنی بیوی سے بات کیوں نہیں کرتے

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہو گیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

سوال :— میں نے تین سال پہلے شادی کی تھی، میں سعودی میں نو سال سے رہتا ہوں، میں جب سعودی چلا جاتا ہوں تو میری بیوی ٹھیک سے نہیں رہتی ہے نہ تو میرے گھر پر جاتی ہے نہ تو میرے پاس خط لکھتی ہے نہ ہی ٹیلی فون کرتی ہے میں تو مہینے کے اندر ۲۴ خط اپنی بیوی کے پاس پوسٹ کر چکا ہوں اس میں سے ایک خط کا جواب آیا ہے اور خرچہ ۵۵۰۰ سو روپیہ نو مہینے کے اندر دے چکا ہوں، میں جب اپنی سسرال فون کرتا ہوں تو اس کی ماں بولتی ہے کہ آپ کی بیوی کا کہنا ہے کہ جب وہ انڈیا آئیں گے تب میں ان سے بات کروں گی۔

جواب :— آپ کی بیوی کو چاہیے کہ وہ آپ کے خطوط کا تشفی بخش جواب دیتی رہے۔ آپ نے اب تک جو خط اسے لکھے ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کہیں راستے میں ضائع ہو گئے ہوں۔ ایسی صورت میں یہ ہو سکتا تھا کہ آپ کسی ہم وطن کو جو چھٹی گذارنے جا رہا ہو اپنے متعلقین کے پاس بھیجتے کہ وہ وہاں جا کر اس پریشانی کا ذکر کرتا جس کا سامنا خط کے جواب نہ وصول ہونے پر آپ کرتے ہیں۔ آپ کی شکایت یہ ہے کہ آپ جب سعودی عرب چلے جاتے ہیں تو بیوی ٹھیک سے نہیں رہتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ فون پر آپ کی ساس آپ کی بیوی کی ترجمانی کرتی ہیں تو اس سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ آئندہ جب ٹیلی فون کریں تو براہ راست اپنی بیوی سے بات کریں ہو سکتا ہے جو بات آپ کو بتائی گئی ہے وہ درست نہ ہو۔

سوال :— میں بظاہر ایک معمولی لیکن درحقیقت سخت الجھن میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں نے اس بیماری کے لیے ڈاکٹروں اور ماہر نفسیات سے رجوع کیا مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں خود کلامی کے مرض میں مبتلا ہوں۔ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو دل ہی دل میں اپنی نظروں کے سامنے کسی کی تصویر رکھتا ہوں پھر اس سے دل ہی دل میں بے شمار باتیں کرتا ہوں۔ مثلاً اگر میرا کسی سے جھگڑا ہو جاتا تو پھر بھی دل ہی دل میں اس شخص کو مار ڈالتا ہوں یا اس سے اپنا بدلہ لے لیتا ہوں۔ یا پھر تنہائی میں اور سب لوگوں کی موجودگی میں بھی مسلسل کسی نہ کسی سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ نفسیاتی اصطلاح میں اس بیماری کو کیا نام دیا گیا ہے۔ اگر یہ کوئی بیماری ہے تو اس کا علاج بتائیں۔

جواب :— آپ کو اپنے راسلے میں عمر، پیشہ، جسمانی و ازدواجی حالت کی تفصیل بھی دینی چاہیے تھی۔ تاہم جس انداز سے آپ نے خط لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ پر یہ کیفیت ہر وقت نہیں بلکہ دن رات کے کسی وقفے میں یا ہفتے دو ہفتے میں طاری ہوتی ہے۔ جب یہ کیفیت گذر جاتی ہے تو آپ پورے ہوش و حواس میں ہوتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ "میں دل ہی دل میں کسی کی تصویر نظر کے سامنے رکھتا ہوں" یہ تو رضا کارانہ عمل ہوا جس میں آپ کی نیت و ارادہ کا دخل پوری طرح ہوتا ہے جب کہ نفسیاتی عارضے میں مبتلا شخص کی نظروں کے سامنے خود بخود بعض ہیولے ایسے بنتے ہیں کہ کبھی وہ ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو کبھی انہیں خود پر حملہ آور ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور وہیں سے اس کی چیخ و پکار خود کلامی اور بڑبڑاہٹ شروع ہوتی ہے۔ خوف کی کڑیاں ہیں۔ جہاں تک نفسیات کا تعلق ہے تو یہ بہت وسیع شعبہ ہے اور نفسیاتی معالجین حتمی طور پر اس کیفیت کو غالباً کسی اصطلاحی زمرے میں رکھ نہ سکیں گے بلکہ ظاہری کیفیات مثلاً اضطراب وغیرہ کے حوالے سے ایسے مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ اور یہ تجربہ آپ کر بھی چکے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس سے ہمیں یہ سرا ملتا ہے کہ آپ کے عارضے کا تعلق ذہن سے کم اور نظام ہضم سے زیادہ ہے سوء ہضم کے باعث دماغ جب متاثر ہوتا ہے تو اس سے ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ بظاہر یہ بات آپ کو معمولی اور غیر اہم نظر آئے گی لیکن آپ اپنے کھانے پینے کے معمولات پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ پھر سوچیں کہ جس دن آپ نے ہمیں یہ خط لکھا کیا اس دن آپ کی طبیعت نسبتاً زیادہ بہتر تھی اور آپ نے گذشتہ اڑتالیس گھنٹوں کے اندر کیا کھایا پیا تھا۔ آپ کی اجابت کی کیا کیفیت تھی قبض تھا یا نہیں تھا۔ اور کیا آپ کو قبض کی شکایت تو نہیں رہتی۔ آپ عموماً کتنے گھنٹے سوتے ہیں۔ اگر کسی دن چھ سات گھنٹے سے کم یعنی تین چار گھنٹے کی ہی نیند آئے تو آپ کی کیا حالت دن بھر رہتی ہے۔ اس نہج پر اپنے روز و شب کا مشاہدہ ایک ہفتے تک ضرور کریں اور اپنی حالت میں کسی بہتر تغیر کا اندازہ کرنے کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ غیر سبزی خور ہیں تو آپ دس دن تک صرف دال روٹی سبزی اور سلاد کو اپنی غذا بنائیں۔ اگر اس دوران قبض کی شکایت ہو تو رات کو ہلکے گرم دودھ کے ساتھ سوتے وقت اسپ غول کی بھوسی ایک چمچہ پھانک لیں۔

Vol. III No. 13 RNI # 57337/94 Reg. DL # 11234/96

THE MILLI TIMES INTERNATIONAL 1-15 JULY, 1996

No Secularism please, We're Muslims!

***Secularism as a political ideology is not compatable with Islam. The Secular dream, at its best, is a fascist's dream, argues* Rashid Shaz**

Today, politicians on all sides are worried about the future of their secular dream. To their dismay, in the midst of all the political yuk-yuk, the new generation of Muslim Indians has woken up to realise that for the country's 250 million Muslims 'their' secular dream is no less than a nightmare. To a Muslim Indian the word secularism is the pits, almost a blasphemy. Recently, during the hectic days of electoral activities, when we were bombarded with the news that the secular order was in danger, when most respectable of our Ulema exhorted us to come to the fore to wage a war against the anti-secular forces and when some of our naive organizations, with a long-standing Islamic reputation notwithstanding, called it our religious duty to act as secular crusaders, letting us believe as if on it depended our destiny, even then, we did not feel moved. In fact no empty or for that matter 'secular' rhetoric could move us. More than 75% Muslims, as the political analysts say, stayed away from the polls. In the absence of a fourth Muslim option we found it ridiculous to vote for this enemy or that foe.

The recent attempts at redefining secularism or attaching some more attractive meanings to it, is more than a mere poll plank. It is a concerted effort to lull the Ummah to sleep for yet another 50 years, giving them a false sense of security. We Muslims don't need a redefinition of secularism, nor do we want to attach new meanings to this existing torment; for the old meanings of secularism and the painful experiences attached to it are yet to fade from our memories. Living a life of political slavery in this secular inferno for almost half a century has given us sufficient understanding about various facets of this oppressive political ideology. From mass rape to organized pogrom, from state terrorism to the Operation Demolition, it has only been the secularism at work. Are these shades of meaning or the list of torture not enough? Why then they still insist on a redefinition?

Every effort to redefine secularism takes it for granted that we Muslims will be upfront in defending it, that if there can be anything meaningful for us to do it can only be to help keep this oppressive secular machinery intact. For the last fifty years we have been the main defenders of this secular fraud. Our concerted efforts constantly brought the secular magicians to power. From Nehru to Devegowda it were we who paid all price to keep this secular system going and it were we, none else, whom the system rewarded with mass rape, pogroms and the unending sufferings of all varieties. What more do we ask for ?

Today, with the fall of the secular order and with the marginalisation of some of our worst enemies, we are again being pulled to the center stage of secular drama. Once again our demand is on high, as scapegoats of secularism. But things are not the same any more. The new generation of Muslim Indians has refused to toe to this line. To them it matters not if the secular polity holds the key or the fascism takes its turn; for they know well that secularism, at its best, is a fascist's dream.

Secularism as a political ideology is not compatible with Islam. The mildest variety of secularism asks us to shun Islamic polity, to ignore the divine guidance in managing the affairs of the state and our day to day life. While secularism calls for a political life away from the Quran and Sunnah, the Quran enjons upon us , in clear terms, to organize our political life as desired by Allah and His prophet, and if we do not organize our mundane life along the Quranic principles,
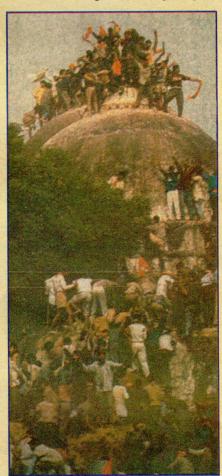
or do not judge by what Allah has revealed to us, we will cease to exist as Muslims (5:4). A secularist can find a role model for himself in a Gandhi or a Nehru but for a Muslim the only role model is to be found in the personality of prophet Muhammed, upon whom be peace. The prophet has not only taught us how to pray he has also given us a political philosophy. Substituting a secular polity with an Islamic one, or accepting some one as our political boss other than the prophet himself would certainly amount to severing all ties with Allah and His prophet. Islam enjoins upon us to accept the faith in full, *Udkholu fis silm Kaffah*. We either take the full package or leave it altogether. Islam does not allow a duel membership. You either be a man of Muhammed or a flunky of a nasty *Mushrik*. You cannot be a member of *Hizbullah* and *Hizbush Shaitan* one and at the same time. To be a secular Muslim is a blasphemous idea.

Islamically speaking, we cannot share a secular dream. No way. Not long ago, some political idiots among us would even talk of National Integration. Now, an old fashioned idea. I still wonder how a sane Muslim can ever imagine that one day the Ummah of Islam and the Ummah of Kufr will fuse into a harmonious whole. It's like uniting fire with water. A wild dream. If today we have any dream it is to establish a just order, not a secular order indeed! And if your secularism falls within our ambit, okay, we don't have any problem. But by no means it is incumbent on us to care least for 'your' secular order.

Last week I was invited to address a gathering of young people. A bright young girl asked me whether in my opinion, it amounted to Kufr to proclaim that secularism was the only viable political ideology for this multiethnic, multi-religious country? "Isn't it in another words", she argued, "we are saying that the Quranic guidance is not relevant for this country, that in our special situation we should not turn to the Quran for a political guidance?" If that be the case, she blushed, this statement was by none but by one of our most respected Ulema. She quoted passages after passages wondering how the most wise men among us have taken a god other than Allah - the idol of secularism.

What is easier for our youngsters to understand is difficult for our 'wise-old-men' to sallow. This secular polity, of de-linking the Quranic guidance from the mundane political life, or taking the disbelievers as our political leaders, was laid down by our great seers like Azad and Madani. Big names. The youngsters, having no burden of history, can judge things at its true value. For them the big names are not the big stumbling blocks but big sad experiments to learn small things. They know it well that without a proper Muslim polity the Ummah will be reduced to an appendage to *Kuffar-o-Mushrekeen*, a plaything in the hands os secular magicians.

A new definition of secularism is certainly not the need of the hour, rather what is needed is a more sympathetic attitude to realize our ideological bindings, our commitments and our own agenda. We're preoccupied with our own things. To rush to the defence of 'your' secularism is too much to expect from us. If we have any message for our long-standing secular 'well-wishers', it is only this message; please get off our backs.

The author is the Leader of the Milli Parliament and Chairman of the Institute of Muslim Ummah Affairs.

Calling for a new political role for Muslims

The country is at the brink of a total collapse. Today it is obvious to many observers that we are steadily marching towards chaos and disintegration. In post-demolition India the secular democratic ideals have lost their credibility and there is no ideology that can hold the country together. As for the political leadership, it is so corrupt, self-centered and power-hungry that it least bothers about the future of this land, its only concern remains to fulfill its personal political whims and vain ambitions. In such a chaotic situation any nation, no matter what great history it may boast of, is doomed to perish. The voices of dissent are coming not only from Kashmir, Assam, Punjab, and Nagaland but from all directions and in some quarters they have gained an alarming strength.... In the wake of ever-growing forces of disintegration and menace of fascism what, then, can hold the country together? Certainly not the coercive state power, nor false promises and empty slogans. If we are open to learn from the Soviet experience, we must come to terms with the reality, we must mend the situation now, we must work hard to avoid the obvious disaster. We must change the direction of this great country which, as we know, is heading towards a blood-bath, a total anarchy in which millions may perish.

We Muslims are not just citizens of this country, we are much more. Being the Ummah of the last Prophet of Allah and being the upholders of the last and final revelation, it is our primary duty to stand against all kinds of oppression, no matter who be the victim and who the victimizer. It is our religious duty to come to the fore to set things right, to challenge the system of Kufr and give a leadership to our beloved country suffering from the crisis of mismanagement and the evil deeds of our corrupt rulers... It was only after the demolition of the Babri Masjid, in December 1992, that a new awareness dawned upon the Muslim Ummah. They started realising that the last 50 years of Muslim political history contain dark pages and the secular democratic ideals are unable to guarantee the protection of their Islamic symbols. The new generation of Muslim leadership, gathered to set up a Milli Parliament in the wake of post-demolition anti-Muslim riots, realized that in practical terms the secular democracy was no less than a constitutional fraud aimed at subjugating India's 250 million Muslims.

Muslims have absolutely no political future within the existing electoral system. Hence major changes must be made. If the unjust rules of the game leave no room for us to win then we must re-write the rules....Today the new generation of Muslim Indians declares this unjust political system null and void and invites the inhabitants of this country to prepare a blueprint of future India in which peace and prosperity may prevail...As a first step in this direction we advocate the adption of a system of proportional representation based on separate electorate...As a second step towards social justice the subcontinent may be turned into a cultural federation...This alone can rescue the sinking boat of the country and save its inhabitants from an impending doom.

Excerpts from the ***Muslim Political Bill*** presented at the 1996 winter session of the Milli Parliament